پیمانے

از

ماہر القادری

مشہور پبلشنگ ھاؤس فراشخانہ دھلی
۱۹۴۶ء

ناشر

مشہور پبلشنگ ہاؤس فراش خانہ
دہلی

بار اوّل　　قیمت عہ　　تعداد ۲۰۰۰ ہزار

مطبوعہ دلّی پرنٹنگ ورکس دہلی

کتبہ اشفاق احمد سنہ ۱۹۴۶ء



مشہور افسانہ نگار ماہر القادری

پیش لفظ

عالم انسانیت میں عام طور پر قدرت کا یہ نظامِ عمل کارفرما ہے کہ مختلف انسان اپنی زندگیوں میں عمل کی مختلف صلاحیتوں کا اظہار کرتے ہیں۔ اس اظہار میں انسانوں کی طرف سے مختلف جہتوں میں کوششیں بروئے کار آتی ہیں اور انجام کار یا تو مساعی کا کوئی ایک پہلو زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے یا پھر کوئی رُخ ہی نمایاں نہیں ہوتا۔ یہی انسانی زندگی کی کامیابی یا ناکامی سمجھی جاتی ہے۔

ایسا تو عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ایک انسان نے آغازِ زندگی میں مختلف علوم و فنون میں کامیابی حاصل کرنیکی جد و جہد کی مگر وہ کسی ایک علم یا فن میں بھی کامیاب نہ ہو سکا اور یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کسی انسان نے مختلف علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنیکی سعی کی اور وہ کسی ایک علم یا فن ہی میں دسترس حاصل کر سکا مگر ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں کہ کسی انسان کی کوششیں مختلف پہلوؤں سے یکساں طور پر کامیاب ہوئی ہوں۔

ماہر القادری قدرت کی اس نوازش کو غالباً کبھی فراموش نہ کر سکیں گے کہ اس نے اُنہیں شاعر بھی بنایا اور افسانہ نگار بھی اور اس حُسن و خوبی کیساتھ کہ کوئی شخص صحیح طور پر یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ وہ بحیثیت شاعر زیادہ کامیاب ہیں یا بحیثیت افسانہ نگار —

یہ اور بات ہے کہ ہندوستان کے مُروجہ مشاعروں اور رسمی ادبی تقریبات نے انھیں ملک میں بحیثیت شاعر زیادہ مقبول اور معروف کر دیا ہے مگر جو لوگ انکی شاعری اور انکے افسانوں کو ذرا گہری نگاہ سے دیکھتے ہیں انھیں یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ ماہر جہاں ایک کامیاب شاعر ہیں وہاں ایک کامیاب افسانہ نگار بھی ہیں۔

زیرِ نظر مجموعہ ماہر کے افسانوں پر مشتمل ہے۔ میرے خیال میں ان افسانوں کے مطالعہ سے پہلے ہر ناظر کو چند باتیں ذہن میں محفوظ رکھنی چاہئیں۔ ماہر کی زندگی مختلف فضاؤں میں گذری ہے انہوں نے صرف مقدس بارگاہوں ہی میں اپنے عزیز لمحات کو صرف نہیں کیا ہے۔ بلکہ اہلِ میکدہ کی سرمستیوں کو بھی قریب سے دیکھا ہے۔ اس نے جہاں بڑے بڑے ترقی یافتہ شہروں کے جگمگاتے ہوئے پُر فریب ماحول میں رہنے والے مہذب انسانوں پر متلاشی حقیقت نگاہیں ڈالی ہیں وہاں دیہات کی نا آشنائے ترقی آبادی میں رہکر وہاں کے سادہ لوح انسانوں کی زندگیوں کا بھی غور سے مُطالعہ کیا ہے۔ ماہر نے جہاں فلم سٹوڈیوز کی فسوں ساز اور باطل سوز نظاروں میں صداقت

کی جستجو کی ہے وہاں عیش و عشرت کی خفیہ پناہ گاہوں میں بھی حقیقت کو تلاش کیا ہے
ماہر نے جہاں دولت مند اور سرمایہ دار طبقہ کے محلوں میں ظالمانہ سیاست کی
کارفرمائی دیکھی ہے وہاں مزدوروں کے جھونپڑوں میں انسانی مظلومیت کی دردناک
حالت کو بھی محسوس کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماہر اپنے افسانوں میں جس ماحول کو پیش
کرتے ہیں وہ تخیلی نہیں ہوتا بلکہ اس میں واقعیت ہوتی ہے۔ اسی طرح جب وہ
کسی کردار کو سامنے لاتے ہیں تو اس خوبی کیساتھ کہ الفاظ تصویر بنکر متحرک ہو جاتے
ہیں اور پڑھنے والیکو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ کی بجائے مشاہدہ میں مصروف ہے
ایک افسانہ نگار کا سب سے بڑا کمال اس کی منظر کشی اور واقعہ نگاری ہے۔ افسانونکو انسانی
زندگی کا آئینہ دار ہونا چاہیئے۔ ماہر کے افسانوں میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ ان
افسانوں میں مختلف انسان اپنی مختلف کیفیات ظاہری و باطنی کے چہروں سے
پردا اٹھاتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان افسانوں میں مناظر منہ سے بولتے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ غرضکہ ان افسانوں میں دنیا۔ انسانوں کی یہ سحر کار اور
فسوں ساز دنیا۔ اپنی تمام رنگینیوں اور رعنائیوں کے باوجود قدم قدم پہ بے نقاب
نظر آتی ہے۔

ماہر کے حالاتِ زندگی نے انھیں مجبور کر دیا ہے کہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کو

مختلف قسم کی ادبی کوششوں میں صرف کریں اور ہر انسان اپنے حالات سے مجبور ہوتا ہی ہے۔ اس لئے نہیں کہا جاسکتا کہ ماہر کی صلاحیتوں کا یہ انتشار کب تک رہے گا ورنہ میں انھیں یہ مشورہ دیتا کہ وہ اپنی تمام تر توجہات افسانہ نگاری اور صرف افسانہ نگاری کی طرف مرکوز کردیں تاکہ ہماری ادبی دنیا ہندوستان کے ایک بہترین افسانہ نگار کے ادبی جواہر پاروں سے زیادہ سے زیادہ مالا مال ہوسکے۔

مجھے امید ہے کہ ماہر القادری کے یہ رنگین، دل چسپ افسانے ملک کے گوشہ گوشہ میں مقبولیت حاصل کریں گے اور اہلِ ذوق و اربابِ ادب ان کی ادبی کاوش کو صحیح طور پر نوازنے میں بخل سے کام نہ لیں گے۔

متین الحق کیف مرادآبادی

مارچ سنہ ۱۹۴۶ء

فہرس

سازش

جوانی اپنی جگہ خود ایک فتنۂ محشر ہے اور جب جوانی کے ساتھ حُسن بھی شریک ہو جائے تو سچ مچ یہ فتنہ قیامت بنجاتا ہے۔ شاما جوان ہی نہیں خوبصورت بھی تھی، مسکراتی ہوئی آنکھیں، گیت گاتے ہوئے ہونٹ، پھول کی ڈالی کی طرح لچکتی ہوئی باہیں، باتوں میں جاذبیت، اداؤں میں دل کشی اور رفتار زاھدِ خشک بھی دیکھے تو گھبرا کر پکار اُٹھے:۔

آپ کے پاؤں کے نیچے دل ہے ایک ذرا آپ کو زحمت ہو گی

شہر کی وہ سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی۔ اس کی خوبصورتی ضرب المثل بن گئی تھی، لوگ کہا کرتے تھے کہ:۔ "ہر جوان لڑکی خوبصورت ہو سکتی ہو مگر شاما نہیں بن سکتی"۔ جس محفل میں شاما چلی جاتی بڑی بڑی مغرور اور حسین و خود دار لڑکیوں کا حسن پھیکا پڑ جاتا اور محفل بھر میں بس وہ ہی وہ نظر آتی۔ حُسن اور غرور شاید ایک ہی تلوار کی دو دھاریں ہیں حسینوں کو مغرور ہی دیکھا گیا ہے مگر شاما کا حُسن غرور کی سطح سے بہت بلند تھا۔ غرور

ایک قسم کا نقص ہو اور کمال کو ہر نقص سے پاک ہونا چاہیئے۔ حسنِ مغرور میں جاذبیت سے
زیادہ ہیبت و رعب پایا جاتا ہو اور فطری حسن ہیبت ناک ہو ہی نہیں سکتا وہاں تو
جاذبیت اور دلکشی کے سوا کوئی اور چیز نظر ہی نہیں آتی۔ غرورِ حسن کی کمزوری کا دوسرا نام ہو
شاما ملنسار اور خوش طبع تھی، مسکراہٹ اس کے نازک اور رنگین ہونٹوں سے شاید
ہی کبھی جدا ہوتی ہو۔ جوانی میں آدمی یوں بھی سنجیدہ نہیں رہ سکتا اور شاما تو بجلیوں کی بنی
ہوئی تھی۔ نچلا بیٹھنا اُسے آتا ہی نہ تھا۔ بنگلہ کے چمن میں جاتی تو ایک حشر بپا ہو جاتا
ابھی اس روش پر گھوم رہی ہو اور آن کی آن میں دوسری طرف پہنچ گئی۔ گلاب کے پھول
توڑے اور پتیوں کو کیاریوں میں بکھیر دیا، چمپا کی ڈالی کو لچکا کر زمین سے لگا دیا، چنبیلی کے
پودے کو اس قدر زور سے ہلایا کہ پھول تو پھول کچی کلیوں کا زمین پر ڈھیر لگ گیا،
بوڑھا مالی دوڑتے دوڑتے تھک جاتا اور شاما ایک دو گملوں کو توڑ پھوڑ کر یہ جا وہ جا،
مالی گملوں کو درست کرتا کہ اتنے میں شاما کے باپ کی گرجدار آواز سنائی دیتی :-

اربے بہاری ! شاما کہاں ہو۔

مالی جواب دیتا :-

سرکار۔ ! بی بی بنگلہ ہی میں ہیں۔

شاما زندگی کی اس منزل میں تھی جہاں قہقہوں اور مسکراہٹوں کے سازہرآن
چھڑے رہتے ہیں۔ نوجوانی کے لُغت میں فکر و پریشانی کا لفظ ہی نہیں ہو۔ جوانی میں تو
غریب مزدور کی لڑکی بھی ہنسی خوشی رہتی ہو اور شاما تو عیش و راحت کی گود میں پلکر
جوان ہوئی تھی۔ اُس کے باپ سیٹھ کشوری لال کے یہاں کس چیز کی کمی تھی، خوشنما
بنگلہ، پائیں باغ، بجلی، ریڈیو، ٹیلی فون، نوکر چاکر اور ایک چھوڑ دو دو موٹر۔ بیفکری

اور عیش و آرام میں جوانی اور بھی حسین ہو جاتی ہے۔ شاما اپنے خوشحال اور دولت مند باپ کی اکلوتی بیٹی تھی، سیٹھ کشوری لال اس کے لئے دنیا کی تمام نعمتیں مہیا کر دینا چاہتے تھے یوں لنگڑی لولی اولاد بھی ماں باپ کو پیاری ہوتی ہے اور شاما کا حسن تو غیروں کو اپنی طرف کھینچتا تھا، دوسرے لوگ جب اُسے آنکھوں میں جگہ دیتے تھے تو ماں باپ کی محبت کا اندازہ ہی نہیں ہو سکتا۔ شاما کی ماں مر چکی تھی اور سیٹھ جی نے اس خیال سے کہ سوتیلی ماں نہ جانے پرائی اولاد کے ساتھ کیسا سلوک کرے، دوسرا بیاہ ہی نہیں کیا۔ وہ چاہتے تو ایک اشارے میں دس جگہ بیاہ ہو سکتا تھا مگر بیٹی کی محبت جذبات پر غالب آچکی تھی، ان کی زندگی کے ہر گوشہ میں شاما ہی شاما نظر آتی تھی۔

شاما میں جہاں اور بہت سی خوبیاں تھیں، وہاں اُس میں ہمدردی اور خدا ترسی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک دن اُس نے چمن میں جا کر دیکھا کہ بوڑھا مالی مولسری کے درخت کی چھاؤں میں بیٹھا ہوا کچھ سوچ رہا ہے، مالی اتنے گہرے سوچ میں تھا کہ شاما کی پہچل بھی اسے سنائی نہ دی، شاما نے مالی کے چہرے کو غور سے دیکھا کہ ایک رنگ آتا ہے اور ایک رنگ جاتا ہے، آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی ہیں اور ہونٹ آہستہ آہستہ ہل رہے ہیں۔

ارے! بہاری۔! تم کیا سوچ رہے ہو۔! شاما نے مالی کے پاس آکر کہا۔

مالی چونک کر اٹھ کھڑا ہوا اور مسکرانے لگا۔ مالی کی مسکراہٹ دل کی کراہ کو نہ چھپا سکی، گہرے سوچ اور شدید فکر کے آثار اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے بلکہ برس رہے تھے۔

بی بی..... تم ہو—! تم.....! اس دھوپ میں یہاں تم کیوں چلی آئیں بنگلہ

ہی سے کہلا کر بھیجدیا ہوتا میں تمھارے لئے پھولوں کے گجرے تمھارے کمرے میں پہنچا دیتا ——— مالی نے جواب دیا ——— بہاری! بات ٹالنے کی کوشش نہ کرو، صاف صاف بتاؤ تم کیا سوچ رہے تھے، تمھیں آخر فکر کس بات کی ہے، ایسا کیا کام آپڑا ہے ——— شاما نے مولسری کا پھول اٹھاتے ہوئے کہا ——— کیا کروگی پوچھ کر ——— ! تم ہنسو کھیلو، پھول توڑو، ڈالیوں پر جھولو، بڑھاپے میں تو سو طرح کی فکریں ہوتی ہیں، میری کس کس فکر کو دور کروگی ——— ! مالی نے آہ بھر کر جواب دیا ——— بہاری! بڑھاپے میں کیا آدمی باؤنی بھی ہو جاتا ہے، میں پوچھ رہی ہوں تم اس وقت کیا سوچ رہے تھے ——— شاما نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا ——— پوچھ کر ہی رہوگی - ! بالک ہٹ کو بڑھاپے پر ترس نہیں آئے گا ——— ! اچھا سنو! تمھاری داسی کملا کے بیاہ کی بات چیت ایک جگہ پکی ہو گئی ہے، اب کے بیساکھ میں اس کے ہاتھ پیلے کرنے کا ارادہ ہے۔ سیانی بیٹی کا گھر میں بٹھانا بھی اچھا نہیں، بی بی جی! زمانہ بڑا خراب ہے چلتے آدمی کو دوش لگتا ہے اس زمانے میں، ! ہم جیسے غریبوں کے پاس تھوڑی بہت عزت آبرو کے سوا اور رہے ہی کیا، اور ——— مالی کہتے کہتے رک گیا ——— بات کہتے کہتے کیوں رک گئے! شاما قدرے جھنجلا کر بولی ——— کیا کہوں ——— ! میری زبان نہیں کھلتی ——— ! کملا کا بیاہ تو سر پر آپہنچا مگر میرے گھر تو کچھ بھی بندوبست نہیں ہے، یہی سوچ رہا ہوں کہ کہیں سے اُدھار پانی مل جائے! لیکن پھر خیال آتا ہے کہ مجھ غریب کی چھان پر تو پھونس بھی نہیں ہے، کسی سے اُدھار کس برتے پہ لینے جاؤں گا ——— مالی نے جواب دیا

——— کملا کے بیاہ میں کتنا روپیہ خرچ ہوگا ——— شاما نے دریافت کیا۔

کچھ نہ ہوں تو دو سو روپے تو ہوں - ! مہنگے کا زمانہ ہے، پیسہ کی چیز چار پیسے
میں آتی ہے مالی نے کہا۔

بہاری ! تم فکر مت کرو، اتنے روپے کا بندوبست کر دیا جائے گا، نوکر کو اپنا
دکھ درد مالک سے کہنا چاہیئے - پتا جی سے تم اس کا ذکر کر دیتے تو اب تک سب کام ٹھیک
ہو جاتا - جاؤ ہاتھ منہ دھو لو، تمہارے ہاتھ پیر گرد میں اٹے ہوئے ہیں
شاما جواب دیتے ہوئے چلنے لگی -

بی بی ! ایشور تم کو سدا سکھی رکھے ! تمہاری ماتا جی بھی میرے دکھ درد کا خیال
رکھتی تھیں وہ آج کو ہوتیں تو کملا کو سونے میں پیلا کر کے سسرال بھیجتیں - کملا کو وہ بہت
چاہتی تھیں مگر اچھے آدمیوں کی عمر تھوڑی ہے یہ دنیا تو پاپیوں کو لینی آتی ہے - بھلے آدمی
یا تو پریشان اور تنگ رہتے ہیں یا بہت جلد ایشور انھیں اپنے پاس بلا لیتا ہے
مالی نے انتہائی تاثر کے ساتھ جواب دیا اور شاما وہاں سے چلی گئی - !

شاما نے اپنے باپ سے کہہ سن کر دو سو روپیہ تو ان سے دلوایا اور کچھ روپیہ اپنے
پاس سے دیا، مالی کے گھر بارات آئی، مالی نے خوب زور کا کھانا کیا - بیٹی کو تھوڑا بہت
جہیز دیا - کملا چاندی کے بھاری زیور پہنکر سسرال چلی گئی - بیٹی کا بیاہ ہونے کے بعد
مالی نے اطمینان کی سانس لی وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے سر پر ایک پہاڑ رکھا ہوا تھا جو
ٹل گیا - بیٹی کے بیاہ کی فکر تو راجاؤں اور بادشاہوں کو بھی ہوتی ہے اور وہ تو بیچارہ غریب
مالی تھا جو سیٹھ کشوری لال کے چمن کی دیکھ بھال کر کے پیٹ پالتا تھا -

سیٹھ کشوری لال کی بڑی بہن جو بیوہ ہو چکی تھیں، گھر کی دیکھ بھال کرتی تھیں،
شاما کو انہی نے پالا تھا - گھر میں کئی نوکرانیاں اور بہت سے نوکر تھے - لکھنے پڑھنے کے

لئے سیٹھ جی نے ایک کلرک رکھ لیا تھا، کلرک کا نام سرداری لال تھا۔ سرداری لال کی انگریزی تعلیم تو میٹرک تک ہوئی تھی لیکن آدمی بلا کا ذہین اور مطالعہ کا بیحد شوقین تھا کتب بینی سے اُس کی قابلیت میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا تھا۔ سرداری لال ان ذہین لوگوں میں سے تھا جو اپنی دُنیا آپ بناتے ہیں۔ اُس نوجوان کی عمر بیس بائیس سال کے لگ بھگ تھی، خاندان کا شریف اور عادت کا نیک تھا۔ اس کے باپ سول سرجن تھے سرداری لال زیادہ سے زیادہ گھٹنیوں چلتا ہوگا کہ اس کے باپ موٹر سے ٹکرا کر مر گئے، سول سرجن صاحب نے جو کچھ روپیہ پیسہ چھوڑا وہ سرداری لال کے خود غرض چچاؤں کے کام آیا۔ پیسہ بڑے بڑوں کی نیت ڈانوا ڈول کر دیتا ہے اور اسی کی بدولت خون اور نسل کے رشتے بھی کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ سرداری لال کا کوئی بوجھ اُٹھانے والا نہ تھا چچاؤں نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ ایسے بے سہارے نوجوان کا تھوڑا بہت لکھ پڑھ لینا بھی بہت کچھ تھا سیٹھ کشوری لال کے یہاں وہ بہت خوش اور مطمئن تھا۔ گھر کے لوگ اس سے نوکر کی طرح نہیں اپنے عزیز کی طرح پیش آتے تھے۔ سرداری لال کی شرافت اور فرض شناسی کسی کو کچھ کہنے اور ٹوکنے کا موقعہ ہی نہ دیتی تھی سرداری لال کہنے کو تو نوکر تھا مگر سیٹھ کشوری لال کے کام کاج سے اُسے اپنے کام کاج کی طرح ہمدردی تھی، آج کل کے نوکر بس فرض پورا کرنے کے لئے لیا دیا کام کرتے ہیں۔ ان کو یہ فکر رہتی ہے کہ کیسے ہی مہینہ ختم ہو اور ان کی تنخواہ سیدھی ہو جائے۔ مالک کے کام اور پیسہ سے ان کو ہمدردی نہیں ہوتی، سرداری لال نہ صرف فرض شناس بلکہ ہمدرد ملازم تھا، سیٹھ جی کا جہاں روپیہ خرچ ہوتا وہاں سرداری لال آنوں اور پیسوں میں کام نکالتا سیٹھ صاحب کے کسی کام سے اسٹیشن جانا ہوتا تو تانگے کے بجائے پیدل

ہی چلا گیا۔ سیٹھ جی نے کہا بھی کہ تانگے میں کیوں نہیں گئے پیدل جانے کی ایسی کیا مار پڑی تھی، تو سرداری لال نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا:۔

"بچپن ہی سے مجھے پیدل چلنے کی عادت ہے اور پھر آج کل میونسپلٹی کی مہربانی نے شہر کی سڑکوں کو گاؤں کی ناہموار گلیوں سے بدتر کر دیا ہے، تانگے میں تو اور ہچکولے لگتے ہیں۔"

سرداری لال کے چہرے سے شرافت برستی تھی، صورت شکل بھی اچھی خاصی تھی۔ کوئی شخص اُس سے ملکر ناخوش نہیں ہو سکتا تھا۔ سرداری لال کو اگر سازگار ماحول ملتا تو وہ بہت بڑا آدمی ہوتا۔ اُس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی تمام صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن یتیمی نے ان تمام صلاحیتوں کو دبا دیا، اُس کے خود غرض چچاؤں نے وہ کیا جو ایک دشمن بھی نہیں کر سکتا۔ یہ تو خدا کا بڑا فضل تھا کہ سرداری لال نے کسی رکاوٹ دباؤ اور نگرانی کے بغیر ہی اپنے کو سنبھال لیا ورنہ کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو شرابی، اُٹھائی گیرہ، دغا باز، جواری اور نہ جانے کیا کیا بنجاتا۔ اس مغرب زدہ تہذیب نے تو قدم قدم پر سیاہ کاریوں کے پھندے لگا دئیے ہیں، طبیعت ذرا بھی پھسلنی اور مزاج تھوڑا سا بھی غیر محتاط ہو تو آدمی پھنسنے سے بچ نہیں سکتا۔

شاما کو گھر باہر کے سبھی لوگ چاہتے اور آنکھوں پہ بٹھاتے تھے۔ سرداری لال بھی اپنے آقا کی اکلوتی بیٹی کو قدر و پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ شاما سے اسکو غیر معمولی ہمدردی اور تعلقِ خاطر تھا۔ اگر سرداری لال کے باپ بھی شاما کے باپ کی طرح دولتمند ہوتے تو یہ تعلقِ خاطر اور ہمدردی محبت اور پیار سے تعبیر کیجا سکتی تھی، لیکن اس دنیا میں جہاں مایا کی پوجا ہوتی ہے غریب آدمی مالدار کے ساتھ محبت کرنے کا تصور ہی نہیں کر سکتا

غریبی اور امیری کے درمیان ایک بہت گہری خلیج حائل ہی جسکو خالی خولی محبت پاٹ ہی
نہیں سکتی، امارت محبت کو بھی چاندی اور سونے کے پیمانے سے ناپتی ہی۔ سرداری اور
شاما دونوں جوان تھے اور ایک دوسرے سے قربت اور نزدیکی ہر لمحہ میسّر تھی، سرداری
لال سیٹھ کشوری لال کے بنگلہ ہی میں رہتا تھا اور گھر کے کاروبار میں بہت کچھ دخیل تھا
مگر آدمی تھا شریف اور نیک باطن۔ تنہائی اور خلوت میں بھی اُس نے شاما کی طرف ایک
انچ بڑھنے کی کوشش نہیں کی وہ چاہتا تو ہنسی ہنسی اور مذاق مذاق میں زیادہ سو زیادہ
بے تکلفی ہو سکتی تھی اور اس زمانے میں جوان مرد اور جوان عورت کے درمیان بے تکلفی
ہو جانا ہی اس بات کی دلیل ہی کہ طرفین ہر اقدام کے لئے تیار ہو چکے ہیں اور ہوسنا کی
کی بارود بچھائی جا چکی ہی بس ذرا دیا سلائی دکھانے کی دیر ہی۔ یہ سب کچھ تھا مگر حُسن کی
کشش کو کوئی قوت روک نہیں سکتی، سرداری لال اس قدر احتیاط کے باوجود بھی محسوس
کرتا تھا کہ شاما کی طرف وہ خود بخود کھنچا چلا جارہا ہے۔ شاما سے بات چیت کرنے میں وہ
خاص لذّت محسوس کرتا تھا، یہ لذت ہوس اور معصیت سے پاک تھی مگر لذت بے معصیت
اور کیفِ بے گناہ میں تو اور زیادہ قوت ہوتی ہی۔ شاما نے بھی کبھی سرداری لال کو ملول
نہیں کیا وہ اس سے نوکروں کی طرح نہیں دوستوں اور عزیزوں کی طرح برتاؤ کرتی تھی۔
سرداری لال میں ایک جوان لڑکی کو متوجہ اور متاثر کرنے کی تمام صلاحیتیں موجود تھیں،
ہاں ایک چیز کی کمی تھی، وہ مالدار نہ تھا اس کمی کو پورا کرنے کا اُس کے پاس کوئی ذریعہ
نہ تھا۔

ایک دن شاما سرداری لال کو ساتھ لیکر شہر کے مشہور فوٹوگرافر کے یہاں تصویر
کھنچوانے کے لئے گئی، فوٹوگرافر نے شاما کو تصویر کشی کے کمرے میں کرسی پر بٹھادیا اور

کیمرے سے شاما کی نشست اور انداز کو دیکھنے کے بعد اُس کے قریب آیا اور بولا:۔
"ساری کو ذرا درست کیجیے، اور ہاتھ کو ذرا ڈھیلا چھوڑ دیجیے، اس گلدان کی طرف دیکھتی رہیے، اس طرح بیٹھئے جیسے کچھ ہو ہی نہیں رہا ہو، سنجیدگی، تکلف اور فوٹو کھچوانے کا احساس چہرے کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے"

فوٹوگرافر نے شاما کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور قریب آکر شاما کے رُخسار کا نچلا حصّہ چھوتے ہوئے بولا:۔

"سر کو ذرا ترچھا رکھئے ...."

اس پر سرداری لال جھپٹ کر آیا اور فوٹوگرافر کا ہاتھ جھٹک کر بولا:۔

"یہ کیا کرتے ہو۔! جو کچھ کہنا ہے زبان سے کہو....."

فوٹوگرافر نے سرداری لال کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا اور شاما بے اختیار مسکرا دی۔ فوٹوگرافر نے مختلف زاویوں سے شاما کے اندازِ نشست Pose کو دیکھا اور کئی بار شاما کا جسم چھونے کی ضرورت محسوس کی مگر سرداری کی موجودگی میں ایسا کرنیکی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ سرداری لال کی نگاہوں میں ابھی تک غصّہ جھلک رہا تھا۔ فوٹوگرافر کے لئے یہ بالکل نئی بات تھی کہ ایک فوٹو کھچوانے والی لڑکی کے ذرا رخسار چھونے پر اس کے ساتھ کے آدمی نے اس قدر بُرا مانا ورنہ اُس کے یہاں تو روزانہ بھائی اپنی بہنوں کو اور شوہر اپنی بیویوں کو لیکر آتے اور فوٹوگرافر جسم کے جس حصّہ کو چاہتا بے تکلفی کے ساتھ چُھوتا اور کسی کو ذرا بھی ناگوار نہ ہوتا۔

تھوڑی دیر میں فوٹو کھنچ گیا، شاما کُرسی سے اُٹھتے ہوئے بولی:۔

"مجھے آدھی درجن کا پیال چاہئیں، آپ جس دن فرمائیں یہی صاحب (سرداری لال)

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) آکر تصویریں لے جائیں گے۔

اس پر فوٹو گرافر نے کیمرے کا سیاہ کپڑا چھوتے ہوئے جواب دیا:۔

بہت اچھا ——— یہ کون صاحب ہیں، ان کا نام کیا ہے۔

شاما جواب دینے والی ہی تھی کہ سرداری لال بیچ میں بول پڑا:۔

آپ فوٹو گرافی کرتے ہیں یا لوگوں کے نسب نامے اور جنم پترلیوں کا پتہ لگاتے ہیں، ہم کوئی ہوں، آپ کو اس سے کیا ——— ! آپ کو تو اپنی اُجرت سے کام ہو!

فوٹو گرافر نے اس پر قدرے جھینپ کر کہا:۔

"اچھا صاحب! میری غلطی ہوئی میں کان پکڑتا ہوں، معافی چاہتا ہوں!

آپ تو بات بات پر لڑتے ہیں، آپ کے سامنے تو منہ سے بات نکالنا قیامت ہے.....!"

سرداری لال اور شاما دونوں موٹر میں بیٹھ کر روانہ ہوئے، راستہ میں شاما نے دریافت کیا:۔

"آپ کا پارہ آج بہت چڑھا ہوا تھا، فوٹو گرافر کو تو کپڑے چھڑانے دوبھر ہو گئے!"

سرداری لال نے جواب دیا:۔

"وہ تو میں اُس نامعقول کا ہاتھ ہی جھٹک کر رہ گیا، ورنہ جی میں تو آیا کہ لات مار کر زمین پر گرادوں۔ کسی شریف لڑکی کا رخسار چھونا مذاق نہیں ہوتا۔!"

شاما نے اس پر کہا:۔

"فوٹو گرافروں کا تو یہ کام ہے کہ فوٹو کھچوانے والے کے بدن اور لباس کو درست کریں تاکہ تصویر ٹھیک آئے"

سرداری لال نے موٹر کی سیٹ سے قدرے اٹھتے ہوئے جواب دیا:۔

"مگر مجھے اُس کی یہ حرکت ناگوار ہوتی، مَیں ایسا ہوتے ہوئے دیکھ ہی نہیں سکتا"
شاما نے اس پر قہقہہ لگایا اور تھوڑی دیر میں بنگلہ آگیا ———— شاما کے علاوہ کوئی اور تجربہ کار اور سمجھدار لڑکی ہوتی تو سرداری لال کے اس جُملہ سے کہ "میں ایسا ہوتے ہوئے دیکھ ہی نہیں سکتا" نہ جانے کیا کیا مطلب نکالتی۔ مگر شاما الھڑ اور معصوم تھی، بات کی باریکی اور نزاکت کے سمجھنے کی اُس میں ابھی تک صلاحیت ہی پیدا نہ ہوئی تھی معصومیت اور پاکیزگی اُلجھاؤ اور باریکیوں میں جانیکی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی۔
سیٹھ کشوری لال کے یہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا، اتنے ملاقاتی شہر میں شاید ہی کسی کے یہاں آتے ہوں گے۔ ان ملاقاتیوں کی زیادہ تعداد سیٹھ صاحب کی حسین وجوان لڑکی شاما کے دیکھنے کی چاٹ میں آتی تھی، لوگ زبردستی کام نکالکر اور ملاقات کی تقریب پیدا کرکے سیٹھ صاحب کے یہاں آتے ———— ان ہوس پیشہ ملاقاتیوں کی گفتگو کتنی فریب آمیز ہوتی تھی :-

"سیٹھ صاحب! میں نے آپ کے چمن میں گلاب کے پھولوں کی بہت تعریف سُنی ہے، مجھے بھی گلاب کا بہت شوق ہے، بیس پچیس قسم کے گلاب میرے باغ میں ہوں گے، مگر سیاہ گلاب کی تلاش ہے، آپ کے یہاں سیاہ گلاب ہو تو دو چار قلمیں مجھے عنایت فرمادیجیے"

"میں آپ کا بنگلہ دیکھنے کے لئے آیا ہوں، اس ڈیزائن کا بنگلہ میں بھی بنوانا چاہتا ہوں، سُنا ہے کہ آپ نے خود ہی مکان کا نقشہ تیار کیا ہے آپ کی ذہانت اور خداداد قابلیت کی داد نہیں دیجاسکتی، شہر میں بڑی بڑی شاندار عمارتیں ہیں مگر آپ کے بنگلہ کی بات کہاں آتی ہے، برآمدے کی محرابیں کتنی حسین ہیں کہ دیکھنے اور بس دیکھتے ہی رہیے

"سیٹھ صاحب! سُنا ہو آپ اس مرتبہ اسمبلی کے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں میں یہی پوچھنے کے لئے حاضر ہوا ہوں، اگر آپ کا ارادہ ہو تو فرما دیجئے دو سو ووٹوں کا میں ذمہ دار ہوں، آپ کی کامیابی یقینی ہی، بھلا وہ کل کا لونڈا راد ھے شام آپ کا مقابلہ کر سکتا ہی۔ بیرسٹر بنجانا اور چیز ہی اور تجربہ اور بات ہی۔"

"ہمارے محلہ کے نوجوانوں نے غریبوں کی امداد کے لئے ایک سوسائٹی قائم کی ہے اُس کا سالانہ جلسہ بڑے دن کی چھٹیوں میں ہونے والا ہی، آپ سے اسکی صدارت کے لئے درخواست کیجاتی ہی، آپ سے زیادہ موزوں آدمی ہم کو مل نہیں سکتا، آپنے انکار کر دیا تو نوجوانوں کی تمناؤں کا خون ہو جائے گا۔"

"سنا ہی کہ آپ زمین خریدنا چاہتے ہیں۔ اسٹیشن کے قریب ہی میری زمین ہی اب تک دو پلاٹ تو بک چکے ہیں اور تین پلاٹ اور باقی ہیں۔ آپ کو زمین اوروں سے کچھ کم قیمت پر دیدوں گا، وہاں میرا بنگلہ بھی ہے میں اچھا پڑوس چاہتا ہوں، فوج کے ٹھیکہ کی بدولت جو یہ قلی کباڑی لکھ پتی بن گئے ہیں میں ان کے ہاتھ زمین بیچنا نہیں چاہتا۔"

"سیٹھ صاحب! میں میونسپلٹی کے آخری اجلاس میں یہ تحریک پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یا تو آپ کا مجسمہ کمپنی باغ میں نصب کرایا جائے یا کوئی سڑک آپ کے نام سے موسوم کی جائے۔ آپ سے ہمارے شہر کی عزت ہے۔ آپ جیسا آدمی صدیوں میں پیدا ہوتا ہی۔ یورپ میں آپ جیسا آدمی ہوتا تو لوگ پرستش کرتے مگر اس غلام ہندوستان میں آدمی کی قدر نہیں ہوتی یہاں تو گھوڑے گدھے سب ایک ہی بھاؤ بکتے ہیں، ـــــ کل شام کے جلسہ میں کلکٹر صاحب آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے

"میں آپ کی سوانح حیات لکھنا چاہتا ہوں اگر تکلیف نہ ہو تو کچھ ضروری باتیں مجھے بتا دی جائیں، ایک پبلشر کتاب چھاپنے کے لئے تیار ہو گیا ہے بلکہ اُس کا تو یہ کہنا ہے کہ سیٹھ کشوری لال صاحب کے حالاتِ زندگی ہاتھوں ہاتھ بکیں گے۔ شہر کے سب لوگ سیٹھ صاحب کو قدر و محبت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"۔

سیٹھ کشوری لال سیدھے سادے آدمی تھے، اُن کے ذہن میں بھی یہ اندیشہ پیدا نہ ہو سکتا تھا کہ یہ آوارہ نگاہ اور بد باطن مہذب مُلاقاتی اُن کی حسین و نوجوان صاحبزادی شاما کی فکر میں آتے ہیں۔ سرداری لال ہر آنے جانیوالے کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھتا اور شاما کی طرف دیکھنے والی ہر نگاہ اُسے ناپسند تھی پسندیدگی کا یہ احساس رقابت میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ سرداری لال کا بس چلتا تو وہ کسی غیر مرد کو سیٹھ کشوری لال کے بنگلہ میں قدم بھی نہ رکھنے دیتا۔ اُس نے شاما سے محبت کا اظہار نہیں کیا اور نہ وہ خود اپنے کو اس کا چاہنے والا اور خریدار سمجھتا تھا لیکن آثار بتا رہے تھے کہ محبت کیلئے زمین خود بخود تیار ہو رہی ہے۔ بے سمجھی کی محبت اور زیادہ معصوم اور قیامت آفرین ہوتی ہے۔ ہر طلوع ہونے والی صبح کو سرداری لال محسوس کرتا کہ شاما کے لئے اس کے دل میں اور زیادہ گنجائش پیدا ہو گئی۔

ایک دن شاما اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تصویریں دیکھ رہی تھی۔ سرداری لال بھی وہاں کسی کام سے آ گیا۔ یہ تصویریں خود شاما ہی کی تھیں جو مختلف موقعوں پر کھنچوائی گئی تھیں، سرداری لال کرسی پر بیٹھ گیا اور شاما اپنی تصویروں کو دیکھ کر خود ہی تنقید کرتی رہی:-

بالکل خراب ہے یہ تصویر، سیدہ آنکھ ٹیڑھی ہو گئی .... ! ارے ! میں

اس طرح بیٹھی ہوں جیسے کسی کے جوتے چرا کر بھاگ جانے کا ارادہ ہے ——— اور یہ
فوٹو تو سب سے خراب ہی، چہرہ کچھ سے کچھ ہو گیا ——— ہاں یہ تصویر نسبتاً اچھی ہے مگر
ساری میں بیسیوں شکنیں پڑ گئیں ——— ! سرداری لال جی آپ کو میری کونسی تصویر
پسند ہی (شاما نے تصویروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرداری لال کیطرف دیکھا)

ہر تصویر اچھی ہے، تمھاری ہر تصویر کو اچھا ہونا ہی چاہیئے -

سرداری لال نے جواب دیا

آپ مجھے بنا رہے ہیں، تصویروں کے دیکھے بغیر ہی فرما دیا کہ ہر تصویر اچھی ہے
شاما نے قدرے جھینپ کر کہا -

تصویر کو کیا دیکھوں جبکہ تم خود سامنے ہو اور تم کو دیکھ کر تیں کیا ہر دیکھنے والا
بے اختیار کہہ دے گا کہ اس صورت کی ہر تصویر کو اچھا ہونا چاہیئے ———
سرداری لال انتہائی سنجیدگی کے ساتھ بولا -

اچھا ——— ! تمام دنیا تصویریں کھنچواتی ہے، آپ اپنی تصویر کیوں نہیں
کھنچواتے ——— شاما نے بات ٹالتے ہوئے کہا -

میں اپنی تصویر کھنچوا کر اور اپنے کو رسوا کروں ! واہ ! یہ منہ اور مسور
کی دال ——— ! اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی ——— ! تصویر تو خوبصورت
آدمیوں کو کھنچوانی چاہیئے ——— سرداری لال نے جواب دیا

تو یوں کہیئے کہ آپ اپنی برائی کر کے اپنی خوبصورتی کی تعریف کرانا چاہتے ہیں -
آپ کا ناک نقشہ تو خاصہ ہی مجھے تو کوئی عیب نظر نہیں آتا ——— ! آج کل تو بدصورت
سے بدصورت آدمی کو فوٹو کھنچوانے کا خبط ہے اور بہت سے بدنما چہرے تو کیمرے

ہیں آکر اچھے خاصے ہو جاتے ہیں اور آپ تو.........

شاما ابھی کہہ رہی تھی کہ سیٹھ کشوری لال نے آواز دی اور شاما بات ادھوری چھوڑ کر اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔

دونوں طرف سے ایک دوسرے کے ناک نقشے کی تعریف ہوئی، پسندیدگی اور دلچسپی کی ایک ہی سطح پر دونوں کھڑے ہوئے تھے، تمناؤں کی زمین آپ ہی آپ ہموار ہو رہی تھی۔ دو جوان دلوں کی دلچسپی بے اثر نہیں رہ سکتی۔ اس چیز سے دونوں بیخبر تھے کہ وہ ایک دوسرے سے دلچسپی کیوں رکھتے ہیں۔ آرزوئیں ابھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں، مگر آثار مستقبل کا پتہ دے رہے تھے۔ محبت کی بیل دلچسپی اور پسندیدگی کے سہارے ہی تو پروان چڑھتی ہے۔ پسندیدگی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ امیری اور غریبی کے درمیانی پردے اٹھ سے رہے تھے۔ مگر پھر بھی شاما رائے بہادر سیٹھ کشوری لال جی کی اکلوتی اور چہیتی بیٹی تھی اور سرداری لال اُن کا کلرک تھا ــــــ کلرک ــــــ! وہ مزدور جو سر اور پیٹھ کی بجائے دماغ پر بوجھ اُٹھاتا ہے جس کی دنیا قلم دوات اور کاغذوں کے چند پلندوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی جس منزل کا آغاز اور انجام ایک ہی ہوتا ہے، جس جگہ ترقی اور مسابقت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے جہاں انسانیت کا جوہر ابھر ہی نہیں سکتا، جس چکر سے ساری عمر نکلنا نہیں ہوتا، انقلابات کی وہاں گنجائش ہی نہیں اور غریب سرداری لال تو ایک بنیئے کا منشی تھا جہاں ترقی کے چشمے پہلے ہی سے بند کر دیئے جاتے ہیں۔

سیٹھ کشوری لال کا کاروبار گاؤں میں بھی پھیلا ہوا تھا فصل کے موقع پر سرداری لال کو سیٹھ جی نے گاؤں جانے کے لئے کہا۔ سرداری لال تیار ہو گیا وہ

اپنے کمرے میں بستر باندھ رہا تھا کہ شاما منہ کا باجا بجاتی ہوئی وہاں آگئی۔

یہ کہاں جانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں ــــــ شاما نے مسکرا کر دریافت کیا۔

گاؤں جا رہا ہوں ــــــ سرداری لال نے بستر بند میں گرہ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

ہاں! ہاں! ٹھیک ہے کل شام پتا جی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بابو سرداری لال کو گاؤں بھیجنا ضروری ہے، پٹواری نے پتا جی کو چھٹی بھی لکھی تھی ــــــ! مگر آپ جانا نہ چاہیں تو میں پتا جی سے کہہ کر کسی دوسرے آدمی کو وہاں بھجوا دوں ــــــ شاما اسٹول پر پیر رکھتے ہوئے بولی۔

آپ کا شکریہ! گاؤں مجھی کو جانا چاہیئے یہ کام مجھ سے متعلق ہی سیٹھ جی نے مجھی کو حکم دیا ہے، مجھے اپنے فرض کا احساس ہے ــــــ سرداری لال نے کہا۔

لیکن ذرا جلد واپس آنے کی کوشش کیجئے ــــــ شاما متاثر ہو کر بولی۔

میں تو صاحب! کام ختم کر کے ہی آؤں گا ــــــ مگر آپ مجھے جلد واپس بلانا چاہتی ہیں، کوئی کام ہے آپ کا مجھ سے ــــــ! سرداری لال نے دریافت کیا۔

سرداری بابو! کام وام تو کچھ نہیں ہے، آپ بنگلہ میں رہتے ہیں تو طبیعت لگی رہتی ہے بس اور کچھ نہیں...... اور ہاں...... وہ جو...... !

شاما کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ سیٹھ جی نے گرجدار آواز میں کہا :-

سرداری بابو! گاڑی کا وقت ہو گیا کمرے میں بیٹھے ہوئے کیا پوریاں سینک رہے ہو ــــــ!

سرداری لال نے بستر بغل میں دبایا اور تانگہ میں سوار ہو کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔

سرداری لال کو گاؤں میں کئی دن لگ گئے، وہ جلد سے جلد شہر واپس جانا چاہتا تھا لیکن ذمہ داریوں کے احساس نے اُسے روک لیا، دس بارہ دن کے بعد وہ شہر واپس آیا۔ بنگلہ میں قدم رکھتے ہی مُلازم نے کہا کہ سیٹھ جی صبح سے آپ کو کئی بار پوچھ چکے ہیں، سرداری لال اپنے کمرے میں سامان رکھکر سیٹھ صاحب سے ملنے گیا ہال میں پہنچا، ملازم نے اطلاع کی، سیٹھ صاحب نے سرداری لال کا نام سنتے ہی کہا:-

ارے میں تو سرداری بابو کا صبح سے انتظار کر رہا ہوں۔

سرداری لال نے سیٹھ جی کو دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور کئی منٹ تک گاؤں کے حالات بتاتا رہا۔ سرداری لال نے دیکھا کہ ایک نوجوان نہایت بے تکلفی کے ساتھ سیٹھ صاحب کے قریب بیٹھا ہوا سگار پی رہا ہے۔

سرداری بابو ——— ! یہ ہماری صابون کمپنی کے سب سے بڑے حصہ دار Share Holder مسٹر ستیش ہیں ——— (سرداری بابو نے مسٹر ستیش کو آداب کیا ....) اور مسٹر ستیش ! یہ ہمارے یہاں کے منشی بابو سرداری لال ہیں، بڑے محنتی سمجھدار فرض شناس ! بس ذرا سا عیب ان میں یہ ہے کہ سوتے بہت ہیں، مگر ان کا بھی کیا قصور ہے، جوانی میں نیند ہی بہت آتی ہے ——— سیٹھ کستوری لال نے حقّہ کا کش لگاتے ہوئے کہا اور ستیش متکبرانہ انداز میں مُسکرایا۔

سرداری لال گاؤں سے آ رہا تھا جہاں بناؤ سنگھار کا کسی کو دھیان تک نہیں آتا، کام کی کثرت تھی اور سرداری لال تو یوں بھی بننے سنورنے کا عادی نہ تھا، سادہ طبیعت، نیک منش، بناوٹ اور تکلفات سے دُور ——— ! وہ سیٹھ صاحب سے ملکر اپنے کمرے میں داخل ہو رہا تھا کہ شاما اخبار ہاتھ میں لئے ہوئے وہاں آ گئی۔

سرداری بابو آگئے ——— ! ہپ ہپ ہُرّے ——— ! مگر آپکے کپڑے ——— !

کیا انجن کے کوئلوں پہ بیٹھ گئے تھے ——— شاما نے ہنسکر کہا۔

کپڑے بدلنے کی فرصت کس کو تھی، گاؤں والوں کو روپیہ پیسہ کا حساب سمجھاتے

سمجھاتے ناک میں دم آگیا، پھر ایک دن بیل گاڑی میں چلا اور ایک رات ریل کا سفر رہا

——— سرداری لال نے جواب دیا۔

سرداری بابو! آپ کو تو اپنے کام کاج میں ہماری یاد کاہیکو آئی ہوگی، مگر

ہمنے تو دن میں کئی کئی بار آپ کو یاد کیا ——— شاما مسکراتی ہوئی بولی اور اتنے

میں ستیش وہاں آگیا اس نے غضبناک نگاہوں سے دیکھا کہ شاما اور سرداری لال ایک

دوسرے سے گھل ملکر باتیں کر رہے ہیں۔

تو سرداری بابو آپ کپڑے بدل ڈالیئے پھر میں آپسے گاؤں کی باتیں پوچھونگی"

گاؤں کی زندگی مجھے بہت پسند ہے۔ میرا تو بچپن گاؤں میں ہی گزرا ہے شاما نے

کہا اور سرداری لال نے اپنے کمرے میں جاکر ٹین کے ٹرنک کو کھول کر دُھلے ہوئے کپڑے

نکالے اور کپڑے کاندھے پر ڈال کر، نل پر نہانے کے لئے پہنچا جو شاما کے کمرے کے

پیچھے باغیچے میں لگا ہوا تھا اور وہاں کمرے کی آواز اچھی طرح سنائی دیتی تھی۔

ستیش اور شاما دونوں شاما کے کمرے میں باتیں کرنے لگے، سرداری لال ان

دونوں کی بات چیت اچھی طرح سُن رہا تھا۔

شاما! تم اس اپنے مُنشی سے برابر والوں کی طرح باتیں کر رہی تھیں، تمھیں

ایسا نہ چاہیئے۔ اس قسم کے برتاؤ سے نوکروں پر رعب نہیں رہتا ——— ستیش

نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

میں اپنے نوکروں کو اپنے جیسا ہی انسان سمجھتی ہوں اور سرداری بابو تو بالکل اپنے گھر کے جیسے آدمی ہیں آپ کے ایسا کہنے سے مجھے دُکھ ہوا آپ نے ایک شریف اور باعزت آدمی کو غریب سمجھ کر اس کی توہین کی۔ شاما نے قدرے جھنجلا کر جواب دیا۔

آپ تو ذرا سی بات کا بُرا مان گئیں، میں نے تو آپ کے ہی بھلے کے لئے نیچ اونچ سمجھائی تھی، آپ کل سے تمام نوکروں کی عورتوں کو سہیلی بنا کر اُن کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلا کیجیے، میرا کیا بگڑے گا، دیکھنے والے تم پر انگلیاں اُٹھائیں گے اور سیٹھ جی کی عزت آبرو پر حرف آئے گا ـــــــ ستیش نے سنجیدگی کے ساتھ کہا۔

میں اپنی اور اپنے پتاجی کی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہوں ـــــــ شاما جواب دیتے ہوئے کتاب پڑھنے میں مشغول ہو گئی تھوڑی دیر تک تو ستیش انتظار کرتا رہا کہ شاما اب اس کی طرف متوجہ ہوتی ہے، اب کوئی بات کرتی ہے مگر شاما دانستہ طور پر کتاب پڑھتی رہی اور ستیش وہاں سے اُٹھ کر چلا آیا۔

ستیش کو یقین ہو گیا کہ شاما سرداری لال سے دلچسپی رکھتی ہے اور ان دونوں کا ایک ہی بنگلہ میں رہنا آج کی دلچسپی کو کل کی محبت سے بدل سکتا ہے۔ ستیش نے شاما ہی کے پھانسنے کے لئے اس کے باپ سیٹھ کشوری لال کی کمپنی کے حصے خریدے تھے، کشوری لال سے ربط ضبط بڑھانے میں شاما کا تصور شریک تھا۔ شاما نے ستیش کو کبھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ستیش نے شاما سے جتنا قریب ہونیکی کوشش کی شاما اتنی ہی دُور ہٹتی چلی گئی۔

ہوسنا کی شکست کھانے کے بعد اور زیادہ مکّار اور ضدّی ہو جاتی ہے۔ ستیش میں اگر ذرا بھی خودداری ہوتی تو وہ شاما کی طبیعت کا رنگ دیکھکر اس سے بالکل

بے تعلق ہو جاتا مگر اُس کے ذہنِ ہوس کار نے سازشوں اور تدبیروں کے بہت سے اوراق اس کی نگاہوں کے سامنے بکھیر دئے، ستیش کے پاس روپیہ پیسہ کی فراوانی تھی، شاما کے سیدھے سادے باپ کو وہ پہلے ہی رام کر چکا تھا، جوانی بھی تھی، اور تمدن و تہذیب کے تمام ممکنہ ذرائع اور اسباب اس کے یہاں موجود تھے اسے یقین تھا کہ شاما آج نہیں تو کل اُس سے مانوس ہو کر رہے گی۔ سرداری لال کو وہ اپنے راستہ میں سنگِ گراں سمجھتا تھا اور وہ دن رات اسی فکر میں تھا کہ اس پتھر کو کسی طرح راستہ سے ہٹا دیا جائے۔ سرداری لال صاف دل اور نیک طبیعت تھا وہ ہر کسی کے سامنے شاما سے بغیر کسی جھجک کے بات چیت کرتا اور ستیش کے دل میں چور تھا اس لئے وہ ہمیشہ تنہائی کی تلاش میں رہتا، اُس کی آنکھوں میں مکاری اور ہوسناکی جھلکتی تھی۔

ستیش باتوں باتوں میں سیٹھ کشوری لال سے سرداری لال کی بُرائی کرتا رہتا لیکن بہت ہی سوچ سمجھ کر گویا کہ وہ سرداری لال کی غریبی سے ہمدردی بھی رکھتا ہے اور سیٹھ صاحب کو بھی تاریکی میں رکھنا نہیں چاہتا۔ انگریزی کے کسی اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی تھی جس میں لکھا تھا کہ کلکتہ کے ایک تاجر کی لڑکی اپنے ملازم کے ساتھ بھاگ گئی۔ یہ خبر سیٹھ صاحب کو خاص طور پر نمک مرچ لگا کر سنائی گئی، سیٹھ کشوری لال بھی اب سرداری لال سے کھٹکنے لگے اور دو ایک دفعہ معمولی سی غلطی پر انھوں نے سرداری لال کو بُرا بھلا کہا۔ سرداری لال کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس کے ساتھ اس قسم کا یہ پہلا برتاؤ کیا گیا تھا ۔۔۔۔۔ بدمعاش ستیش کی رقابت اپنا کام کر رہی تھی۔

بسنت کے تیوہار پر شاما کی سالگرہ بڑی دھوم دھام سے منائی گئی ستیش نے بہت سی قیمتی چیزیں شاما کو تحفہ میں دیں۔ شاما نے ستیش کی دی ہوئی چیزوں میں گھڑی کو خاص طور پر پسند کیا ہوسناکی کو ذرا سا سہارا چاہیے ستیش اتنی سی بات پر دل ہی دل میں ہوائی قلعے باندھنے لگا کہ شاما پر اس کی تدبیروں کا جادو چل گیا، شاما اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہی تھی، بلاؤز وہ پہن چکی تھی، ساری لپیٹے ہوئے آئینہ کو دیکھ رہی تھی کہ اتنے میں ستیش اس کے کمرے میں دندناتا ہوا آگیا۔ شاما نے شرما کر سینہ کو ساری سے چھپا لیا، عورت کی یہ ادا حسین ترین ہوتی ہے۔ ستیش بیخود ہوا جا رہا تھا مگر شاما کے ان خشمگیں جملے نے،

"آپ بغیر اجازت میرے کمرے میں کیسے چلے آئے، نہایت افسوس کی بات ہے" ستیش کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ ستیش نے اسی دن اپنے کانوں سے شاما اور سرداری لال کو بات چیت کرتے ہوئے سُنا اور اس کی رقابت خوفناک انتقام میں تبدیل ہو گئی، روپیہ کے زور پر کیا کچھ نہیں ہو سکتا، بے گناہ کو قاتل اور قاتل کو بے گناہ بنایا جا سکتا ہے۔ سرداری لال کا اس شہر میں کون تھا غریب کا کوئی ساتھی نہیں ہوتا۔ سالگرہ کے دن شاما زرق برق لباس پہن کر کچھ سے کچھ ہو گئی تھی۔ کاجل کی سیاہی، پان کی لالی، پھولوں کی صباحت، زیور کی جگمگاہٹ اور لباس کی پھبن نے شاما کو سر تا بقدم قیامت بنا دیا تھا، جوانی اور مسرتیں ایک دوسرے کا منہ چوم رہی تھیں۔ شام کو باغیچے میں ٹہلتے ہوئے سرداری لال سے ملاقات ہوئی۔

ایک بات پوچھوں .... بتاؤ گے ——— شاما نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔

فرمائیے تو سہی ——— سرداری لال نے جواب دیا۔

آپ نے ہمیں سالگرہ پر کوئی تحفہ نہیں دیا ——— شاما شرما کر بولی

تحفہ تو آپ کی خدمت میں پیش کر چکا ہوں مگر امیروں کے بھاری اور قیمتی تحفوں کے سامنے غریبوں کے تحفوں کو کون پوچھتا ہے —— سرداری لال نے کہا۔

تو اب ہمیں بیوقوف بنانا شروع کر دیا ہے —— شاما نے جواب دیا۔

مسٹر ستیش نے جب تمھاری کلائی پر گھڑی باندھی ہے تو میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، وہی آنسو میرے تحفے تھے سرداری لال نے متاثر ہو کر کہا۔

اس منحوس گھڑی نے تمھارے دل کو دُکھ پہنچایا ہے —— یہ کہتے ہوئے شاما نے گھڑی کلائی سے کھول کر حوض کے پتھر پر پٹک دی۔

ستیش اپنی اسکیم جلد سے جلد مکمل کرنا چاہتا تھا۔ شہر کے بدمعاشوں اور اہلِ سازش کی ایک ٹولی اس کے ساتھ تھی، بس سرداری لال کو ذرا وہاں سے نکلوانے کی دیر تھی اس کے لئے سیٹھ جی کے نوکروں کو روپیہ دے دلا کر تیار کر لیا تھا، ایک دن شاما غسلخانہ میں نہا رہی تھی، سیٹھ صاحب اپنے کمرے میں حجامت بنوا رہے تھے اور ستیش برآمدے میں بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ سرداری لال شاما کے کمرے کے قریب سے گذرا کہ نوکروں نے شور مچانا شروع کیا۔

"جھانک رہے تھے، جھانک رہے تھے"

سیٹھ کشوری لال اس شور کو سنکر باہر آ گئے، نوکروں نے کہا اور اس کی تصدیق کمینہ فطرت اور سازشی ستیش نے کی کہ شاما غسل خانہ میں نہا رہی تھی اور سرداری لال کواڑوں کی دراڑ سے اندر جھانک رہا تھا۔ سیٹھ صاحب آگ بگولا ہو گئے، انھوں نے گرجتے ہوئے کہا:۔

اسی وقت میرے بنگلہ سے نکل جا ورنہ گولی مار دوں گا۔ بدمعاش کہیں کا!

دنیا میں کسی کے ساتھ بھلائی کرنے کا زمانہ ہی نہیں رہا !

سرداری لال دم بخود تھا اور کہتا بھی تو کیا کہتا۔ سازش مکمل ہو چکی تھی۔ مجرم کی آہ و فریاد اور عذر معذرت سے گناہ ہلکا نہیں ہو جاتا۔ سیٹھ کشوری لال ایک حرف بھی سننے کے لئے تیار نہیں تھے۔ بے گناہی پناہ ڈھونڈ رہی تھی لیکن سازش نے ہر پناہ کا دروازہ بند کر دیا تھا اُس نے کمرے میں جا کر اپنے کپڑے لتّے لپیٹے اور جب وہاں سے روانہ ہوا ہی تو شاما برآمدے میں کھڑی ہوئی بال سکھا رہی تھی۔

یہ شور کیسا تھا ...... ! اور سرداری بابو آپ کہاں جا رہے ہیں شاما نے دریافت کیا۔

شاما ! تم اندر جاؤ، تم یہاں کیسے آگئیں ...... سیٹھ جی نے عتاب آمیز لہجہ میں کہا اور شاما جانیوالے (سرداری لال، پر ایک نگاہ ڈالتی ہوئی اندر چلی گئی، سرداری لال وہاں سے روانہ ہوا، مگر اس طرح !۔

مری نگاہ کی تصویر کوئی لے لیتا اُٹھا رہا ہو زمانہ ہی آستاں سی مجھے

وہاں سے جانے کے بعد سرداری لال ایک دوست کے یہاں ٹھیر گیا، سرداری لال تنہا تھا، ایک آدمی کو پیٹ پالنا کیا مشکل ہو اُس کے لئے بیسیوں ملازمتیں موجود تھیں، اُسے تو بس شاما کا غم کھائے جا رہا تھا ستیش کی سازش اُس کی نگاہوں کے سامنے تھی یہ سوچ کر اُس کے دل میں ہوک اٹھتی تھی کہ مکار اور بد فطرت ستیش نہ جانے شاما کے ساتھ کیا چال چلے اور اس بیچاری نادان لڑکی کا کیا حشر ہو ! سرداری لال نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی جان کو خطرے میں

ڈال کر شاما کو بچائے گا، شاما کی عزت آبرو کی حفاظت اُس کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ سرداری لال خود بھی سازش کا زخم خوردہ تھا اُس نے سوچ لیا تھا کہ مکر کا توڑ مکر سے ہوگا اور قوت کا جواب قوت سے دیا جائے گا۔ اُس نے سرداری لال کے بدمعاش دوستوں کا پتہ لگا لیا تھا اور ان کی نقل و حرکت پر اُس کی گہری نظر تھی۔

ستیش سمجھتا تھا کہ سرداری لال کے جانے کے بعد شاما کی توجہات کا رُخ اس کی طرف ہو جائے گا مگر اس کا اندازہ غلط نکلا، شاما اُس سے اور زیادہ بے توجہی کا برتاؤ کرنے لگی، ستیش شاما کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی تمام تدبیریں ختم کر چکا تھا۔ اب اس کے پاس سازش رہ گئی تھی جو اس کی نگاہ میں آخری اور قطعی تدبیر تھی۔ ستیش کے پاس روپیہ تھا۔ شہر کے چھنٹے ہوئے بدمعاش اُس کے ساتھ تھے، ہوس کاری کو بہر حال اپنے لئے راستہ نکالنا تھا۔ سازش مکمل ہو گئی بس ذرا اُس کو عملی جامہ پہنانے کی دیر تھی۔ تمام احتیاطی تدابیریں اختیار کی جا چکی تھیں۔

سرداری لال اپنے کام سے غافل نہ تھا، اُسے بھی دو چار ہمدرد دوست مل گئے تھے۔ ایک دن دوپہر کے وقت سرداری لال کو ایک خط اس کے دوست نے لا کر دیا جس کے پڑھتے ہی وہ سائیکل پہ سوار ہو کر سیٹھ کشوری لال کے بنگلہ کی طرف دوڑا، وہ انتہائی تیزی کے ساتھ سائیکل چلا رہا تھا، راستہ میں ایک تانگہ سے ٹکر ہو گئی اور سرداری لال کا سر پھٹ گیا، راہگیروں نے کہا کہ چوٹ زیادہ آگئی ہے اس شخص کو تانگہ میں ڈال کر ہسپتال لیجاؤ، سرداری لال نے سختی کے ساتھ منع کر دیا۔ وہ اسی حالت میں لہولہان سیٹھ صاحب کے بنگلہ میں پہنچا، سیٹھ صاحب بیمار تھے اور اُن کی بیٹی شاما دوا کی شیشی ہلا کر دوا پیالی میں اُلٹ ہی رہی تھی کہ سرداری لال نے

کمرے میں داخل ہو کر دوا کی شیشی کو زمین پر دے مارا شیشی چھن سے ٹوٹ گئی اور سرداری لال بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا اس کا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا گویا کہ وہ جیب سے کوئی چیز نکالنا چاہتا ہے، سب لوگ حیران تھے کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ سرداری لال کو ہسپتال پہنچایا گیا اس کی جیب سے ایک خفیہ خط برآمد ہوا جس میں لکھا تھا:۔

مسٹر ستیش!

سیٹھ کشوری لال کے دستخط سادہ کاغذ پر لے لئے گئے، ان کو کئی دن سے بخار ہے۔ اسی اتوار کو ڈاکٹر کی دوا میں زہر قاتل ملانیکا انتظام کرا دیا جائیگا۔ آپ مطمئن رہیں سب کچھ ٹھیک ہوا ہے اور ٹھیک ہی ہوگا ——— ڈی۔ ایم نمبر ۶۵

اس خط کی روشنی میں پولیس نے سازشیوں کو گرفتار کیا، مسٹر ستیش پر کئی کئی مقدمے قائم ہوئے۔ اس واقعہ کے چند ماہ کے بعد نینی تال کی ایک خوشنما سڑک پر سرداری لال اور شاما کو ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا،

تو تم نے اُس دن مجھے نہاتے ہوئے جھانک کر کیوں دیکھا تھا ——— شاما نے دلربایانہ انداز میں کہا۔

ہونیوالی بیوی کو اس طرح دیکھا جا سکتا ہے ——— سرداری لال نے جواب دیا۔

تو تم مجھے اپنی ہونیوالی بیوی سمجھتے تھے ——— شاما ساری کا پلو سنبھالتی ہوئی بولی

جو کچھ سمجھا تھا وہ پورا ہو کر رہا، یار لوگ تو بھر پور ہاتھ ڈالتے ہیں۔ سرداری لال نے جواب دیا اور بادل کا ایک ہلکا پھلکا ٹکڑا دونوں کو نمناک بناتا ہوا گذر گیا، شاما کی زلفیں سرداری لال کے شانوں پر رقص کر رہی تھیں +

مذاق

پری چھم اپنے شہر کی مشہور طوائف تھی اور شہر میں کیا دور دور اس کا شہرہ
تھا، خوبصورت طوائفیں عام طور پر زیادہ خوش گلو نہیں ہوتیں مگر پری چھم حسن و موسیقی
کا پیکرِ رنگین تھی، اُس کی اداؤں میں دل کشی اور اس کی باتوں میں جاذبیت تھی، اور
اس کے گلے میں تو قدرت نے سچ مچ ہارمونیم لگا دیا تھا وہ گانا نہیں گاتی تھی جا
کرتی تھی اُس کے ہاں جنتِ نگاہ کا سامان بھی تھا اور فردوسِ گوش کی بھی کمی نہ تھی
فیروزی ساری پہنکر جب وہ نرت کرتی تو شدتِ جذبات سے تماشائیوں کے سینے
اوپر نیچے ہونے لگتے، اُس کی نگاہیں چاہے میخانہ بدوش ہوں یا نہ ہوں لیکن بارہا
ایسا دیکھا گیا کہ شرابی تماش بینوں نے اس کے یہاں شراب کی بوتلیں کھولیں گلاس
میں شراب اُنڈیلی اور پری چھم کی نشیلی آنکھوں کی نرت دیکھکر انھوں نے بہت
سے بہت ایک دو گھونٹ شراب پی اور شراب سے لبریز گلاس چاندنی پر دھ
کے دھرے ہی رہ گئے۔ لوگ مذاق میں کہا کرتے تھے کہ کسی شرابی سے شراب
چھڑانی ہو تو اُسے ایک آدھ ہفتہ پری چھم کے یہاں لے جاؤ۔

طوائف کا پیشہ بناوٹ کے بغیر چل ہی نہیں سکتا، وہاں تو جان بوجھ کر

ساری ڈھلکائی جاتی ہے اور لوگوں کو بیوقوف بنانے اور متاثر کرنے کے لئے انگڑائیاں لی جاتی ہیں۔ مگر پری چھم کی اداؤں میں اس قدر دل کشی تھی کہ مصنوعی اداؤں اور بناوٹی غمزوں کی اُس نے ضرورت ہی محسوس نہیں کی، بناوٹ اور تصنع آرٹ کے ادھورے ہونے کی دلیل ہے جہاں آرٹ مکمّل ہوتا ہے وہاں بناوٹ نہیں پائی جاتی پری چھم کامیاب آرٹسٹ تھی حُسن، جوانی، بھبن، نغمہ، دلکشی، تہذیب وسلیقہ سبھی کچھ اس کے پاس موجود تھا قدرت نے اسے دل کھول کر نوازا تھا اور قدرت کی بے محل فیاضی پر کون حرف گیری کر سکتا ہے، بندوں کو یہی حکم دیا گیا ہے کہ جو بھی کچھ دنیا میں نظر آئے بس دیکھتے رہو زبان سے کچھ نہ کہو قدرت کے بھید اور مشیت کی مصلحتیں تنقید سے بالا تر ہیں۔

پری چھم کے یہاں سچ مچ ہُن برستا تھا جو آتا وہ کچھ نہ کچھ دے کر ہی جاتا تماش بینوں کی رقابتوں نے اس کی آمدنی میں اور اضافہ کر دیا تھا، ہر شخص جانتا تھا کہ طوائف پیسہ کی میت ہوتی ہے۔ اس لئے خرچ کرنے اور دولت لٹانے کے میدان میں ہر تماش بین مسابقت کی کوشش کرتا، کسی لالہ جی نے سونے کی پہنچیاں بنوائیں تو اس کے جواب میں کسی شیخ صاحب نے موتیوں کا گلوبند تیار کرا دیا، طوائف کے کوٹھے پر پہنچکر کفایت شعاری اور احتیاط کا تصور بھی قوتِ مردانہ کی توہین سمجھا جاتا ہے۔ وہاں تو آدمی لُٹنے کے لئے ہی جاتا ہے۔

اس زمانے کی طوائفوں نے یہ رنگ دیکھکر کہ آج کل کے نوجوان پڑھی لکھی لڑکیوں کو بہت پسند کرتے ہیں اور تعلیم یافتہ لڑکیاں چاہے خوبصورت نہ ہوں، مگر تہذیب، سلیقہ، گفتگو اور سوشل social ہونے کے سبب نوجوانوں کو

گرویدہ کرلیتی ہیں، انھوں نے بھی کالج گرل بننا شروع کردیا ہے، پری چھم کی بڑھیا نانی نے بھی اپنی نواسی کے لئے ایسی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا کہ پری چھم اعلیٰ سے اعلیٰ سوسائٹی کو تہذیب و گفتگو سے متاثر کرسکتی تھی، نوجوان طوائفیں یوں بھی چٹاخ پٹاخ ہوتی ہیں اور پری چھم تو فطرتاً ذہین تھی، کتابوں کے مطالعہ کا بھی اسے شوق تھا وہ ہر موضوع پر بے تکلفی سے گفتگو کرتی اور پڑھے لکھوں سے "ہاں" کہلوا کر چھوڑتی۔ اس کی گفتگو کے چند فقرے اگر درج نہ کیے گئے تو افسانہ شاید نامکمل رہے گا:۔

——— میں غالب کی بہت معتقد ہوں مگر صحیح تغزل مومن کے یہاں پایا جاتا ہے

——— میں نے موسیقی کی کتاب میں پڑھا ہے کہ سارنگی اصل میں "سازِ رنگی" ہے، کثرتِ استعمال سے لوگ سارنگی کہنے لگے۔

——— ہٹلر سے بڑی سخت غلطی ہوگئی ڈنکرک کے بعد ہی انگلستان پر حملہ کرنا تھا مگر اب برطانیہ بہت زیادہ تیار ہے۔

——— ہندوستان کی یونیورسٹیاں تو کلرک ڈھالنے کی مشینیں ہیں۔

——— قورمہ میں بادام گلانے کی ترکیب مجھے معلوم ہے۔

——— لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کو غزل کہنی نہیں آتی، میں کہتی ہوں کہ اقبال کی غزل کے اس مطلع کا کوئی جواب ہے۔

ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں　　مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

غرض پری چھم کے ترکش میں ہر طرح کا تیر موجود تھا۔
ایک مہذب نوجوان سوداگر جسے سب لوگ نواب کہا کرتے تھے پری چھم

کے یہاں بہت زیادہ آیا جایا کرتا تھا، پری چھم سے اس کی بہت بے تکلفی تھی، آدمی پڑھا لکھا اور خوش مزاج تھا۔ ایک دن پری چھم کے یہاں مردوں اور عورتوں کے کردار کی بحث چھڑ گئی، نواب کہتا تھا کہ مردوں کا کیریکٹر بہت مضبوط ہوتا ہے اور پری چھم یہ کہتی تھی کہ مرد تو بہت ہی پھسلنی طبیعت کے ہوتے ہیں، عورت کی ذرا سی توجہ محتاط سے محتاط مرد کے پاؤں ڈگمگا سکتی ہے، بحث ہی بحث میں بات بڑھنے لگی۔ پری چھم نے کہا کہ آپ کل دن چھپے ریلوے جنکشن پر پہونچ جائیے میں وہاں آؤں گی، آپ بالکل اجنبیوں کی طرح دور سے تماشا دیکھئے کہ میں کیا کرتی ہوں، نواب نے اسٹیشن آنے کی "ہامی" بھر لی بات پکی ہو گئی

پری چھم دن چھپنے سے پہلے ریلوے جنکشن پر پہنچ گئی، وہ بالکل کالج گرل معلوم ہوتی تھی، طوائفوں کے انداز شاید وہ اپنے بالاخانہ پر تہ کر کے رکھ آئی تھی، نواب بھی وقتِ مقررہ پر وہاں آگیا، نواب پری چھم کو دیکھ کر قدرے ہنسا مگر پری چھم نے بے توجہی کے ساتھ منہ پھیر لیا نواب نے بھی گھبرا کر ہنسی روک لی۔ پری چھم پہلے زنانہ ویٹنگ روم میں گئی وہ اپنے ساتھ سوٹ کیس لائی تھی جسے ویٹنگ روم میں قلی کے ذریعہ رکھوایا گیا چند منٹ ویٹنگ روم کی آرام کرسی پر وہ بیٹھی رہی اس کا منہ دروازے کی طرف تھا ایک نوجوان کئی بار وہاں سے گذرا، پری چھم نے ایک آدھ بار نوجوان کی طرف قدرے غور سے دیکھا، نوجوان کی رفتار میں تیزی آگئی اور وہ اس طرح کہ ویٹنگ روم کے برآمدے میں وہ تیز تیز ٹہلنے لگا مگر دروازے کے سامنے آکر اس کی رفتار دھیمی ہو جاتی۔ پری چھم محسوس کر چکی تھی کہ شکار پھنس چکا۔ اب اس کی اسیری اور نو گرفتاری سے ذرا لطف اٹھانا چاہیئے، ویٹنگ روم سے وہ باہر آئی اور ریلوے بک اسٹال پر

پہنچی، نوجوان نے اس کا پیچھا کیا، کتابوں کی دکانوں پر پہنچ کر اس نے انگریزی رسالوں کو اِدھر اُدھر سے پڑھا اور انگریزی کی ایک کتاب خریدی، نوجوان اس کے قریب آکر بک اسٹال کی میز پر رکھے ہوئے اخباروں کو دیکھ رہا تھا اور ہاں! اخباروں کا دیکھنا تو ایک بہانہ تھا پری چھم کا حسین چہرہ اُس کی نگاہوں کا مرکز تھا۔

——— یہ کتاب شاید دلچسپ ہوگی ——— پری چھم نے اس انداز میں کہا جیسے وہ نوجوان سے مشورہ کرنا چاہتی ہے۔

——— جی ہاں! یہ کتاب کیا اس مصنف کی ہر کتاب دلچسپ ہوتی ہے میں اُس کے کتنے ہی ناول پڑھ چکا ہوں ——— نوجوان نے جھجکتے ہوئے جواب دیا اور پری چھم نوجوان کا جواب سن کر آہستہ آہستہ چلنے لگی، چلتے ہوئے اُس نے بالارادہ پنسل ہاتھ سے گرادی اور انجان بنکر آگے بڑھ گئی، نوجوان نے خوش ہوکر پنسل اُٹھالی اور دوڑتا ہوا پری چھم کے پاس آکر بولا:۔

"لیجئے! یہ آپ کی پنسل ہے ———"

پری چھم نے مسکرا کر کہا:۔

"او۔ تھینک یو"

اُس کے شکریہ کرنے کا انداز نوجوان کے لئے ساتھ چلنے کی دعوت تھا، نوجوان اُس کے ساتھ ہولیا اور آپس میں گفتگو ہونے لگی۔

پری چھم نے باتوں باتوں میں اس سے کہدیا کہ وہ رات میں ایک بجے کی ٹرین سے کلکتہ جارہی ہے اُس کے باپ ایک فرم کے منیجر ہیں اور نوجوان نے تو اپنے خاندان بھر کا کچا چھٹا سنا دیا۔ پری چھم کو نوجوان کے کہنے سے معلوم ہوا کہ اُس نے

گزشتہ سال بی۔ اے کا امتحان پاس کیا ہو اور وہ یونیورسٹی کے کانووکیشن کے جلسہ میں بی، اے کی سند لینے کے لئے آیا تھا۔

—— ذرا بی۔ اے کی سند تو دکھائیے، میں بھی تو دیکھوں کہ کس ڈویژن میں آپ نے کامیابی حاصل کی ہو —— پری چھم نے بڑے ناز سے کہا۔

—— ضرور دیکھئے..... یہ لیجئے..... نوجوان یہ کہہ کر ایک بڑے لفافے سے ایک کتاب نکالنے لگا۔

—— یہ کتاب ہی مجھے دیدیجئے، میں سند خود نکال کر دیکھ لوں گی، آپ تکلیف کیوں کرتے ہیں —— پری چھم قدرے مسکرا کر بولی۔

—— سند تو آپ ایک منٹ میں پڑھ لیں گی مگر یہ کتاب بھی پڑھنے کے لایق ہو۔ میں نے یہ کتاب لندن سے منگوائی ہو ہندوستان میں تو کسی کتب فروش کے یہاں مل نہیں سکتی —— نوجوان نے پری چھم کو کتاب پکڑاتے ہوئے کہا۔

—— آپ کا شکریہ —— ! آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر کے لئے اس کتاب کو دیکھ لوں —— پری چھم نے دریافت کیا۔

—— ارے صاحب! اجازت کی کیا ضرورت ہو، کتاب آپ کی ہے جب تک جی چاہے پڑھئے اور اگر پسند آجائے تو یہ آپ کی نذر ہو..... ! ہاں! ڈنر کا وقت ہوگیا چلیے ریفرشمنٹ رُوم میں چلیے کھانا کھائیں گے —— نوجوان نے تیزی کے ساتھ کہا۔

—— میں تو شام سے پہلے کھانا کھانے کی عادی ہوں اور وہ بھی پرہیزی۔! آپ کھانا کھا لیجئے میں انکوائری آفس میں گاڑیوں کے اوقات معلوم کر لوں، اُسکے

بعد اطمینان سے بات چیت کریں گے ——— پری چہم نے جواب دیا اور نوجوان نے جاتے ہوئے پری چہم کے جسم سے اپنے کاندھے کو آہستگی سے ٹکرایا پری چہم نے اقدام کا جواب تصادم سے دیا گویا کہ نوجوان کے اس اقدام کو اس نے بخوشی گوارا کرلیا، نوجوان پری چہم کی اس حرکت پر لڑکھڑا کر رہ گیا، ریلوے ہوٹل میں پہنچ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا اور کئی بار آئینہ میں اپنے چہرے کو دیکھا اس تصور کے ساتھ کہ یہ حسین چہرہ ایک انتہائی حسین لڑکی کو اپنی طرف راغب کرچکا ہے اور تھوڑی دیر میں رہی سہی اجنبیت بھی جاتی رہے گی —— بیسویں صدی کی محبت تو دو چار گھنٹے میں کہیں سے کہیں پہونچ جاتی ہے۔

دو اور نوجوان دور ہی دور سے پری چہم کو گھور رہے تھے مگر ایک نوجوان مرد کو اس کے ساتھ دیکھ کر قریب آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی، لیکن وہ برابر چکر کاٹ رہے تھے اور پری چہم ان کی بے تابی اور شوق کے اتار چڑھاؤ کو اچھی طرح محسوس کر رہی تھی، پہلا نوجوان جو اپنا ناول اور بی، اے کی ڈگری پری چہم کو دے چکا تھا جب چلا گیا تو پری چہم نے ان نوجوانوں کی طرف توجہ کی جو پری چہم کے عشق میں قریب قریب مبتلا ہو چکے تھے۔ ان کی بے تابی اس بات کا پتہ دیتی تھی کہ یہ نوجوان قیس اور فرہاد کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

ریلوے پلیٹ فارم پر بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے پری چہم بجلی کی روشنی میں اور زیادہ حسین معلوم ہوتی تھی۔ اس نے نوجوان کے قریب پہنچکر اس انداز کے ساتھ کمر کو لچکا کر سینہ کو ابھارا کہ وہ دونوں کے دونوں ایک دوسرے کو بھینچکر سرگوشی کرنے لگے، پری چہم نے ان کی طرف نگاہِ التفات سے دیکھا اس پذیرائی کو دیکھ کر وہ تو خود

ہو گئے، پری چہم اُن کے قریب سے گذری ..... آہستہ آہستہ! جسے شاعروں کی اصطلاح میں خرامِ ناز کہتے ہیں ———!

——— نہ جانے اس وقت کتنے بجے ہیں ——— ! پری چہم نے نوجوانوں کو سُناتے ہوئے کہا۔

——— اس وقت! نو بجنے میں سات منٹ ہیں ——— نوجوانوں نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

——— آپ کا شکریہ۔! ——— پری چہم مسکرا کر بولی۔

——— آپ تشریف کہاں لے جا رہی ہیں .... اور ہاں! وہ آپ کے ساتھ جو صاحب تھے کہاں چلے گئے ——— ان میں سے ایک نے دریافت کیا

——— ہم کلکتہ جا رہے ہیں، وہ میرے بھائی ہیں اس وقت ہوٹل میں کھانا کھانے کے لئے گئے ہیں ...... ذرا آپ کی گھڑی ! پری چہم نے رُکتے ہوئے کہا۔

——— جی .... گھڑی —! ذرا کھلکر فرمایئے ——— نوجوان بولا۔

——— مجھے تھرما میٹر سے اپنا ٹمپریچر دیکھنا ہے، تھوڑی دیر کے لئے آپ اپنی رسٹواچ عنایت فرما سکتے ہیں ——— پری چہم نے قدرے لجاجت کیساتھ کہا۔

——— گھڑی کیا آپ کے لئے جان حاضر ہے۔ کیا فرما رہی ہیں آپ! ———
نوجوان نے جواب دیتے ہوئے کلائی سے گھڑی کھول کر پری چہم کو پکڑا ہی تو دی۔

——— شکریہ! میں ابھی آتی ہوں ——— پری چہم نے جاتے ہوئے کہا اور زنانہ ویٹنگ رُوم سے نکل کر تیسرے درجہ کے مسافرخانہ کی طرف چلی گئی، پری چہم کا آشنا نواب ایک ایک بات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی کے ساتھ پری چہم کے قریب آیا۔

پری چھم "جلدی مت کرو، ڈرامہ ابھی پورا نہیں ہوا" کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔
تیسرے درجہ کے مسافرخانہ میں مسافروں کا بڑا ہجوم تھا، پری چھم وہاں ٹہلنے لگی ایک اچھے خاصے مولوی نما بزرگ کی نظر پری چھم پر پڑی اور جم کر رہ گئی، پری چھم نے ہزاروں نگاہوں کو پڑھا تھا اور ہوسناک نگاہ کو تو وہ اس طرح پہچانتی تھی جیسے پرند اپنے آشیانوں کو پہچان لیتے ہیں۔ مولوی صاحب پری چھم کو گھورنے لگے اور پری چھم مولوی صاحب کی نگاہوں کو نظارہ بازی کا موقع دینے لگی، پری چھم مسافرخانہ کے ستون کے قریب کھڑی ہو کر کتاب پڑھنے لگی، مولوی صاحب کی تو باچھیں کھل گئیں کہ یہ کاروانِ ناز چلتے چلتے خود ہی ٹھیر گیا۔ مولوی صاحب پری چھم سے بات چیت کرنے کی تدبیر سوچ رہے تھے اور تدبیر ان کے ذہن میں بہت جلد آگئی۔

— آپ ہمارا ٹکٹ پڑھ دیں گی مولوی صاحب نے صدری کی جیب سے ٹکٹ نکالتے ہوئے کہا۔

— پٹنہ تک کا ہی یہ ٹکٹ — پری چھم نے ٹکٹ کو خوب غور سے پڑھتے ہوئے جواب دیا۔

— آپ کہاں تشریف لے جا رہی ہیں — مولوی صاحب نے دریافت کیا

— ہاوڑہ جنکشن — پری چھم نے قدرے ملتفت ہو کر جواب دیا۔

— مجھے بھی کلکتہ میں ایک ضروری کام تھا کیا ٹکٹ بدلا جا سکتا ہے مولوی صاحب نے کہا۔

— ہر ٹکٹ بدلا جا سکتا ہے، میں آپ کا ٹکٹ بدلوا کر لاتی ہوں، کلکتہ تک

آپ کا ساتھ ہی رہے گا ———— پری چھم چلتے ہوئے بولی اور مولوی صاحب کہتے ہی رہے کہ "روپیہ تو لیتی جاؤ" پری چھم نے ہاتھ کا اشارہ کیا کہ بھئیرو روپیہ پھر دیدینا۔

پری چھم نے خونچہ والوں کی آڑ سے نواب کو اشارہ کیا، زنانہ ویٹنگ رُوم سے اُس کا سوٹ کیس منگوایا گیا اور دونوں ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے گئے ٹیکسی والا ان دونوں کو عیش بازار میں چھوڑ کر پھر اسٹیشن واپس آگیا۔ راستہ میں پری چھم نے نواب سے کہا کہ کہو کیا دیکھا اب آپ کی مردوں کے متعلق کیا رائے ہے؟ نواب نے پری چھم کے رُخسار کو ٹھوکا دیکر کہا کہ جانِ من! تم جیتیں اور ہم ہارے ——!
پری چھم نے اس پر قہقہہ لگایا ———— فاتحانہ قہقہہ جس میں دِل رُبائی کے بہت سے انداز مسکرا رہے تھے۔ کوٹھے پر آکر نواب، پری چھم اور اس کی نائکہ اور سازندے بہت دیر تک ہنستے رہے۔

وہی دونوں نوجوان جن میں سے ایک کی کلائی کی گھڑی پری چھم نے لی تھی ریلوے ہوٹل کے دروازے پر ٹہلنے لگے، بی۔ اے پاس نوجوان ہوٹل سے کھانا کھا کر نکلا اور دونوں نے بڑی سنجیدگی سے اُس کو سلام کرتے ہوئے کہا۔

———— آپ کی ہمشیرہ صاحبہ زنانہ ویٹنگ رُوم میں ہیں۔

نوجوان نے چونک کر جواب دیا:۔

———— کیسی ہمشیر، کس کی ہمشیرہ! بکتے کیا ہو۔

نوجوان کے اس جواب پر دونوں کے دونوں متحیّر ہو کر رہ گئے۔

———— آپ کے ساتھ جو خاتون تھیں انھوں نے آپ کو اپنا بھائی بتایا تھا اور

وہ یہ کہہ کر کہ میں تھرما میٹر سے اپنا ٹمپریچر دیکھوں گی میری گھڑی لے گئیں ——
ایک نوجوان نے کہا۔

اور میری بی۔ اے کی ڈگری ——— نوجوان دبے لفظوں میں کہتے ہوئے زنانہ ویٹنگ روم کے دروازے پر آ کر جھانکنے لگا، ویٹنگ رُوم کی ملازمہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُس عورت کا سُوٹ کیس ایک میانہ قد کا آدمی قُلی کے سر پر رکھوا کر لے گیا یہ لوگ آپس میں چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ اتنے میں مولوی صاحب تشریف لے آئے اور گھبرا کر بولے:-

——— بابو صاحب! آپ نے ایک لانبے قد کی خوبصورت سی عورت کو دیکھا ہے، بادامی رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی وہ ——!

ان تینوں میں سے ایک نے جواب دیا:-

——— کیوں کیا کام ہے اُس عورت سے آپ کا !

مولوی صاحب نے جواب دیا:-

——— صاحب! وہ میرا ٹکٹ لے آئی ہے، مجھے اس گاڑی سے پٹنہ جانا ہے۔

اس پر تینوں نے قہقہہ لگا کر کہا:-

——— لیجئے! ان کا نام بھی دل پھینک بے وقوفوں کی فہرست میں لکھیئے

تین وہ نوجوان اور ایک یہ ہمارے مولوی صاحب چاروں کانا پھوسی کرنے لگے وہ کسی سے اپنی بات کہتے ہوئے بھی ہچکچاتے تھے۔

ویٹنگ رُوم کی ملازمہ نے قلی کو پہچانا اور قلی نے اُس موٹر ٹیکسی کی نشاندہی

کی جو پری چھم کو اس کے مکان لے گئی تھی اُسی گاڑی میں سوار ہو کر چاروں پری چھم کے یہاں پہنچے، پری چھم ٹھمری گا رہی تھی، ان چاروں کو دیکھ کر وہ بے اختیار ہنس پڑی اور ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا، چاروں کے چاروں سر جھکا کر بیٹھ گئے اور مولوی صاحب کا تو یہ حال کہ جیسے بجلی کے ذریعہ اُن کی رُوح کھینچ لی گئی۔

ٹھمری گانے کے بعد پری چھم نے پہلے نوجوان کو ناول اور بی۔ اے کی سند دیتے ہوئے کہا:۔

——— آپ کی تکلیف فرمائی کا شکریہ! یہ لیجئے ناول اور سند حاضر ہے، اور اگر ان کے ساتھ دل بھی لپٹ آیا ہو تو وہ بھی واپس ہے۔

اس کے بعد دوسرے نوجوان کو کلائی کی گھڑی دیتے ہوئے بولی:۔

——— یہ آپ کی گھڑی ہے —! میں نے اس کی آواز سے آپ دونوں کے دل کی دھڑکنوں کو سنا، مگر کچھ یوں ہی سی تھیں جیسے سڑک پر دوا بیچنے والے آوازیں لگایا کرتے ہیں ———!

اور آخر میں مولوی صاحب کو ریل کا ٹکٹ دیتے ہوئے کہا:۔

——— قبلہ و کعبہ! ٹکٹ حاضر ہے ———! خوب کہا اکبر الہ آبادی نے:۔

بغیر شرع کے گو شیخ تھوکتے بھی نہیں مگر اندھیرے اُجالے میں چُوکتے بھی نہیں

اور ہاں! آپ سب مجھے معاف کر دیں یہ مذاق بھی تھا اور امتحان بھی ———!

چاروں کے چاروں شرماتے ہوئے پری چھم کے بالاخانہ سے روانہ ہوئے یہاں قہقہے فضا میں گونج رہے تھے اور ادھر بے آبروئی کا خیال اور بے وقوف بننے کا احساس دلوں میں چٹکیاں لے رہا تھا ✣

بے گناہ چور

تاج محل فنِ تعمیر کا شاہکار اور چاندنی رات میں تو وہ صنعتِ انسانی کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ عمارتیں تو دنیا میں بہت سی ہیں مگر تاج محل میں جو کشش اور جاذبیت ہے وہ کسی میں نہیں، تاج محل کو مرمریں محرابوں، خوشنما جالیوں اور اُبھرے ہوئے گُل بوٹوں سے زیادہ شاہجہاں کے جذبۂ محبت نے حسین اور دلکش بنا دیا ہے خالی پتھروں میں کیا رکھا ہے یہ محبت ہی جو تاج محل کے در و دیوار سے برستی ہے اور یہی کشش لوگوں کو دور دور سے کھینچکر بلاتی ہے۔ تاج محل حقیقت میں خوابِ محبت کی حسین تعبیر ہے، جو لوگ تاج محل کے صرف پتھروں کو دیکھنے کے لئے آتے ہیں وہ تاج محل کے ساتھ ناانصافی کرتے ہیں۔ تاج محل کا سینہ ایسی خراشوں سے بھرا پڑا ہے شاہجہاں اگر زندہ ہوتا اور اس کے ہاتھ میں حکومت ہوتی تو ایسے نامنصف اور بے ذوق سیاحوں کو اس بارگاہِ محبت میں قدم بھی نہ رکھنے دیتا۔!

چودھویں رات تھی۔ تاج محل میں تماشائیوں کا میلہ لگا ہوا تھا صدر دروازے سے لیکر تاج محل کے آخری حصے تک آدمی ہی آدمی تھے، حوض پر ہجوم، پائیں باغ میں بھیڑ، روشوں پر اژدحام، مرمریں صحن میں جمگھٹ اور چمن کا سبزہ تو آج کی برابر شاید

کبھی پامال نہ ہوا تھا۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ چاندنی نے تاج محل کے حُسن کو دوبالا کردیا یا تاج محل نے چاندنی میں چار چاند لگا دئے۔ چاندنی کی کشش کا کون منکر ہوسکتا ہے مگر تاج محل کے سوا اور کہیں وہ اتنی بھلی معلوم نہیں ہوتی۔

اس مجمع میں بُرقعہ پوش عورتیں بھی تھیں اور بے پردہ بھی۔ تماشائیوں کے پرے کے پرے عورتوں کے پیچھے تھے۔ شاید وہ اسی نظارے کے لئے یہاں آئے تھے۔ تاج محل لاکھ حسین سہی مگر انسانوں کے حسین چہروں کے سامنے اینٹ پتھروں کو کون دیکھتا ہے۔ عورتیں بھی اس قدر بن سنور کر آئی تھیں کہ کوئی ان کو دیکھنا بھی نہ چاہے تو بھی دیکھنے پر مجبور ہوجائے۔ یہ عورتیں نگاہوں کا مرکز بننے کے لئے ہی شاید یہاں آئی تھیں، شوخیاں، چہلیں، خوش فعلیاں، فقرے، کسی نے سرو کے درخت کی ڈالی کو جُھکا دیا۔ کوئی حوض کا پانی اُچھالنے لگی۔ کسی نے سینہ کو اُبھار کر اپنی طرف دیکھا اور مُسکرا دی۔ دیکھنے والے لوٹ ہوئے جاتے تھے۔ مردوں کی ہوسناکی اور آوارہ نگاہی اپنی جگہ ثابت اور مسلّم لیکن یہ بے حجاب عورتیں ہیں جو مردوں کی آوارہ نگاہی کی ہمت بڑھاتی ہیں، نگاہوں کو نظارے کی دعوت دیجاتی ہے۔ خوب سوچ سمجھکر مردوں کو متاثر کرنے کے انداز اختیار کئے جاتے ہیں۔ شیطان ہر شخص کے ساتھ لگا ہوا ہے اور حوّا کی یہ نالائق بیٹیاں شیطان کی پذیرائی کے مواقع پیدا کرتی ہیں۔

تاج محل کے صحن میں سچ مچ بہت سی قیامتیں چل پھر رہی تھیں۔ حُسن، تفریح باغ، چاندنی رات، خوشنما نظارے، مُلتفت نگاہیں، گرم جذبات — ! تاج محل میں کسی چیز کی کمی نہ تھی، بازاری قسم کے نوجوان شعر گنگنا کر فقرے کس رہے تھے:-

______ پلٹ ____ تیرا دھیان ہی کدھر ____!

______ جوانی کا صدقہ اِدھر دیکھ لینا۔

______ ارے شبو! بھئی تیرے سر کی قسم میں تو آج قتل ہو گیا۔

______ دیکھا جو حُسنِ یار طبیعت مچل گئی

آنکھوں کا تھا قصور چھری دِل پہ چل گئی

______ پہلوان ـ او پہلوان ـ! آسمانی رنگ کی ساڑی والی کو تو ذرا دیکھ ـ!

مار ڈالا ظالم نے ـ!

______ دل فنس (پھنس) اب جُلف (زُلف) گرہ گیر میں تیرے

اب اس کے نکل جانے کی تدبیر نہیں کچھ

تعلیم یافتہ نوجوانوں کی بات چیت کا انداز کچھ اور تھا:۔

______ اشفاق ـ! میں نے اس شلوار والی کو شاید کسی دعوت میں دیکھا ہے

یہ کسی ریلوے آفیسر کی لڑکی ہے۔ مگر صاحب! قیامت ہی قیامت ____! اب کی دفعہ

کسی دعوت یا پارٹی میں مُلاقات ہو گئی تو کچھ کر کے رہوں گا ـ!

______ پانڈے جی! میں حوض کے قریب جا کر کھڑا ہوتا ہوں تم میرا نام لے کر

زور سے پکارنا، اس عورت کو کسی طرح مُتوجّہ تو ہونے دو پھر دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔

______ علیم کے بچّے تُو کیوں اکڑتا ہی اُس لڑکی نے میری طرف دیکھا تھا تو اِس

غلط فہمی میں ہی کہ تیری طرف توجّہ کی تھی ـ! میں تو شام سے اس کا پیچھا کر رہا ہوں،

قسم خدا کی اس کے پیچھے پھرتے پھرتے پیر تک تھک گئے ہیں مگر یہ محنت خالی نہ

جائے گی میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کی نگاہوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔

فریدون! ارے وہ لڑکیاں ہماری طرف آرہی ہیں، جب وہ ہمارے پاس آجائیں تو تم مجھ سے فلمی گانا سُنانے کی فرمائش کرنا میں انکار کروں گا مگر تم ماننا نہیں۔!

——— آغا! آج تو کلیجے پر وہ تیر کھائے ہیں کہ یاد رہیں گے بھئی! ایک ہو تو برداشت کی جاسکتی ہے، یہاں تو قدم قدم پر قیامتوں کا سامنا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو جوان لڑکیاں ہرنیوں کی طرح کُلیلیں کر رہی ہیں، ہم تو خیر آدم کی اولاد ہیں میں کہتا ہوں فرشتے بھی ان مناظر کو دیکھ کر دل و نگاہ پر قابو نہیں رکھ سکتے۔

——— بے نیاز ایں قدر چرا شد
بندہ پرور! مگر خدا شد

عورتیں ان فقروں کو سُن سُن کر خوش ہو رہی ہیں، وہ تو وہاں اسی لیے آئی تھیں کہ اُن کے حسن و جمال کی تعریف کی جائے لوگ ان کو دیکھیں اور بے چین ہو جائیں یہی جذبہ تو عورتوں کو پردے سے باہر لاتا ہے، بے پردگی اور بے حجابی نظارہ بازی کے لئے دعوتِ عام ہے۔

منوہر بھی اپنے ایک دوست کے ساتھ شبِ ماہتاب میں تاج محل دیکھنے کے لئے آیا تھا، منوہر اور اس کا دوست دونوں قریب قریب ہم عُمر تھے، منوہر کی مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کا دوست بہت سے بہت دو چار مرتبہ سبزۂ خط کی نمود کو اُسترے کی نذر کر چکا تھا۔ منوہر معمولی ناک نقشہ کا نوجوان تھا مگر اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی کشش پائی جاتی تھی، اُس کے دوست چھیڑا کرتے تھے کہ منوہر نے مسمریزم کے عمل کے ذریعہ آنکھوں میں چمک پیدا کی ہے لیکن مسمریزم کا عمل جس چمک کو آنکھ میں پیدا کرتا ہے وہ چہرے کو اور بے رونق بنا دیتی ہے منوہر کی آنکھوں میں فطری کشش تھی۔

منوہر اور اُس کا دوست اس ہنگامہ سے کچھ الگ تھلگ سے نظر آرہے تھے

صحن کے مشرقی حصہ میں نہر کے قریب لوگوں کی بھیڑ زیادہ نہ تھی۔ منوہر اور اس کا

دوست وہیں سبزے پر بیٹھ گئے۔

کنول! یہ تو بتاؤ کہ اس زمانہ میں کوئی راجہ یا بادشاہ تاج محل بنوانا

چاہے تو کیا ایسی عمارت بن سکے گی ——— منوہر نے سبزے پر لیٹتے ہوئے دریافت کیا۔

——— نہیں بن سکتی، قیامت تک نہیں بن سکتی وہ کاریگر کہاں سے آئیں گے

اور تاج محل میں جیسا پتھر لگا ہے اُس میل کا پتھر تو اب ملتا ہی نہیں، ارے بھئی!

تاج محل کا جواب دنیا پیش نہیں کر سکتی۔ شاہ جہاں کے پریم کی جے ہو

کنول نے ٹوپی اتارتے ہوئے جواب دیا۔

——— دقیانوسی خیالات ہیں تمہارے! اس زمانہ میں بھی تاج محل بن سکتا ہے

نئی دہلی دیکھی ہو تم نے! کیسی کیسی عمارتیں انگریز انجنیروں نے بنوائی ہیں آجکل کی

عمارتوں کے ڈزائن اور طرح کے ہوتے ہیں، تاج محل کو فرشتوں نے نہیں آدمیوں

نے بنایا تھا ——— منوہر نے کہا۔

تمہارے انگریز انجنیروں کا کیا کہنا (قہقہہ لگاتے ہوئے) اسمبلی ہال میں

اجلاس ہو رہا تھا کہ اسمبلی ہال کی چھت کا پتھر دھڑام سے گر پڑا، آجکل کی عمارتیں تو

بس لفافے ہیں لفافے! ادھر بنیں اور اُدھر مرمت ہونے لگی۔ نئی دہلی کی عمارتوں

کو تاج محل کے مقابلہ میں پیش کروگے تو لوگ تمھیں دیوانہ بتائیں گے

کنول سگرٹ سُلگاتے ہوئے بولا۔

——— کنول! تم تو لڑنے لگے یار! میں نے تو یہ دیکھنے کے لئے کہ تم کتنے پانی میں

ہو یونہی کہہ دیا تھا، مجھے خوشی ہوئی کہ ہندوستانی صنعت سے تم عقیدت رکھتے ہو۔

...... اور میں کیا ...... ! منوہر کی بات ابھی ادھوری تھی کہ پودوں کے قریب سے عورت اور مرد کی بات چیت کی آواز آئی اور منوہر خاموش ہو گیا۔

—— تو اب مُلاقات کہاں ہو گی —— لڑکی نے بھنچی ہوئی آواز سے کہا۔

—— میں تم کو لکھ کر بھیجدوں گا —— مرد نے جواب دیا۔

—— دیکھئے ! ایشور کے لئے اب خط میرے گھر کے پتہ پر نہ بھیجدیجئے، وہ تو پوسٹ مین نے میرا خط مجھی کو دیا، پتاجی مکان پر نہ تھے ورنہ قیامت ہی تو آجاتی —— لڑکی پودے کی ڈالی جُھکاتے ہوئے بولی۔

—— نہیں اب ایسی غلطی نہیں ہو گی ...... تم اطمینان رکھو ...... مرد کی آواز دبی ہوئی سی تھی جیسے اُس کے ہونٹ کسی دوسری چیز سے مس ہو رہے ہیں۔!

دُودھ سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی منوہر پودوں کی آڑ میں تھا مگر اُس نے لڑکی کو اچھی طرح دیکھ لیا، چھریرا بدن، سُرخ و سپید رنگ، لانبا قد، ہونٹوں کی لالی، "Lip-stick" ذرا پھیکی پڑ گئی تھی، لڑکی کے ہاتھ میں خوبصورت ہینڈ بیگ تھا، اُس کے انداز میں رم خوردگی سی تھی کہ ذرا پتہ کھڑکا اور وہ چونّی ہو کر دیکھنے لگی۔

—— دیکھا کنول ! یہ کیا ہو رہا ہے —— منوہر نے دبی زبان سے کہا۔

—— تفریح گاہوں میں تو یہی ہوا کرتا ہے ...... ! فلم والوں کو چاہیئے کہ وہ ایسے موقعوں پر اپنے کیمرے لیکر آجایا کریں جہاں کوئی Love-Scene نظر آیا اور کھٹ سے تصویر لے لی —— کنول بات کرتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا، لڑکی اور مرد وہاں سے جا چکے تھے۔ اُسی رات میں کئی مرتبہ منوہر نے اُس لڑکی کو دیکھا

منوہر رات گئے گھر کو چلا آیا بات آئی گئی ہو گئی۔

منوہر اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا، ہندوؤں میں یوں بھی چھوٹی عمر میں بیاہ ہو جاتا ہے اور منوہر کی بوڑھی دادی تو مرنے سے پہلے پوتے کے سر پر بیاہ کا مکٹ دیکھنا چاہتی تھی اُس کی دادی کا منوہر کی شادی کے لئے بیحد اِصرار تھا۔ اس بوڑھی کا بس چلتا تو منوہر کی مسیں بعد میں بھیگتیں اور بیاہ پہلے ہو جاتا منوہر کے باپ کو بھی بوڑھی ماں کی تمناؤں کا پاس تھا اور منوہر یوں بھی شادی کے قابل ہو گیا تھا۔ کئی جگہ بیاہ کی بات چیت چلی آخر ایک جگہ بات طے ہو گئی۔ منوہر کو اتنی خبر تو تھی کہ اُس کے گھر والے اس کی شادی کی فکر میں ہیں۔ مگر شادی کہاں ہو رہی ہے، لڑکی کیسی ہے۔ لڑکی کے گھر والے کیا کرتے ہیں؟ اس سے وہ بالکل بے خبر تھا، ہندوستان کے لڑکے اور لڑکیاں ماں باپ کے حُسنِ انتخاب پر "ایمان بالغیب" رکھتے ہیں اور بیاہ شادی کے مُعاملہ میں وہ دخل نہیں دیا کرتے ——— !

منوہر کو صرف اتنی خبر تھی کہ کانپور کے ایک متموّل گھرانے میں اُس کی بیاہ کی بات پکّی ہو گئی، لڑکی ایف۔ اے میں پڑھتی ہے اور لڑکی کے دو بھائی لندن میں تعلیم پاتے ہیں۔

منوہر کے باپ قدرے آزاد خیال تھے بیٹے کی شادی کا مُعاملہ طے ہو جانے پر انھوں نے چاہا کہ لڑکی کا فوٹو منوہر کو دکھا دیا جائے وہ بیٹے سے اپنے حُسنِ انتخاب کی داد بھی چاہتے تھے کہ کیسی چاند سی بہو تلاش کی ہے۔ ایک دوست کی معرفت لڑکی کی تصویر منوہر تک پہنچائی گئی، منوہر نے اپنی بیوی کی تصویر کو دیکھا اور اس کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا، اُس کے حافظہ نے تاج محل کی چاندنی رات کے ورق کو

اُلٹ دیا یہ وہی لڑکی کی تصویر تھی جسے منوہر نے شب ماہ میں تاج محل کے باغیچے میں ایک مرد کے ساتھ دیکھا تھا۔ تصویر کو دیکھکر وہ سناٹے میں آگیا، اُسنے اپنی آنکھیں فوٹو پر گاڑ دیں۔

——— یہ تو وہی لڑکی ہی ——— اُس نے دل ہی دل میں کہا اور جسکے ہاتھ منوہر کے باپ نے تصویر بھجوائی تھی وہ کہنے لگا:۔

——— منوہر! تمھارے پتاجی نے ہزاروں کنیاؤں میں سے اس لڑکی کو چُنا ہی یہ لڑکی اپنے وقت کی شکنتلا ہے کیسا سُندر چہرہ پایا ہی اس نے!

منوہر خاموشی کے ساتھ سب کچھ سُنتا رہا وہ گہرے سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اُس آدمی کے جانے کے بعد اُس نے کاغذ اُٹھایا اور ایک خط لکھ کر نوکر کو دیا کہ پتاجی کو دے آؤ اُس خط میں لکھا تھا:۔

پتاجی!

آپ کا حکم سر آنکھوں پر! مگر میں بی۔ اے کا امتحان دینے سے پہلے بیاہ کرنا نہیں چاہتا ایشور کے لئے میری اتنی سی بات مان لیجئے...... ! یہ میری پہلی اور آخری استدعا ہی!

منوہر کے باپ بیٹے کا خط پڑھ کر آگ بگولا ہو گئے:۔

بڑے سرپھرے ہو گئے ہیں آج کل کے نوجوان! ماں باپ کو تو سمجھتے ہی نہیں! اپنی چلتی چلاتے ہیں۔ ہمارے پتاجی نے تو ہمارا بیاہ آٹھ سال کی عمر میں کر دیا تھا۔ کلجگ ہی کلجگ! بیاہ شادی کے معاملہ میں لڑکے بولتے ہیں۔ ! پرشوتم (ملازم)، تم منوہر بابو سے جاکر کہہ دو کہ میں زبان دے چُکا ہوں، بات طے ہو چکی ہے،

شادی ہوگی اور ابھی ہوگی جوتشی جی نے دن تاریخ اور وقت مقرر کر دیا ہے۔

ملازم نے منوہر کے باپ کی کہی ہوئی ایک ایک بات منوہر کے سامنے بیان کر دی۔ منوہر باپ کی عادت سے واقف تھا، اُس کے باپ میں جہاں اور بہت سی خوبیاں اور اچھائیاں تھیں وہاں ایک بہت بڑی بُرائی تھی اور وہ یہ کہ وہ غضب کے ضدی تھے، جس بات پر اڑ گئے بس سمجھ لو کہ وہ ہو کر رہے گی، چاہے ادھر کی دنیا اُدھر کیوں نہ ہو جائے۔ ضدی آدمی معاملہ کے نشیب و فراز بہت کم سوچتے ہیں۔ ان کو تو اپنی ہٹ سے کام، انجام میں چاہے سونے کے بدلے مٹی ہی کیوں نہ ملے مگر اس قسم کی ذہنیت کے لوگ اپنی ضد سے باز نہیں آتے۔ ضدی آدمی سمجھتا ہے کہ اگر اس کی بات نہ مانی گئی یا وہ اپنی بات سے از خود ہٹ گیا تو اس کی غیرت کا خون ہو جائے گا بس یہی احمقانہ جذبۂ غیرت ضدی آدمی کو ہٹ دھرم بنا دیتا ہے منوہر کے باپ ایک ساہوکار سے جائداد کا مقدمہ لڑ رہے تھے۔ ساہوکار نے دو تین پیشیوں کے بعد ہی تصفیہ کے لئے سلسلہ جنبانی کی مگر منوہر کے باپ اڑ گئے کہ تصفیہ نہیں ہوگا، اُن کے وکیلوں نے بھی سمجھایا کہ مقدمہ لڑنے سے بہتر یہ ہے کہ تصفیہ کر لیا جائے دوسری طرف سے سمجھوتے کے لئے ہاتھ بڑھا ہے تو آپ فائدہ ہی میں رہیں گے مگر یہ کس کی سننے والے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ عدالت سے ان کے خلاف فیصلہ ہوا اور ہزاروں روپیہ حرجہ اور خرچہ کا دینا پڑا۔

منوہر کو بڑی فکر تھی کہ کرنا کیا چاہیئے، باپ اپنا فیصلہ صادر کر چکے تھے کہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی، منوہر اس تصور سے کہ وہ آبرو باختہ لڑکی اس کی بیوی بننے والی ہے پہروں بے چین رہتا، اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے اُسے مرجانا

قبول تھا مگر اُس لڑکی کے ساتھ بیاہ کرنا قبول نہ تھا وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ چُکا تھا اس مصیبت سے بچنے کی ایک ہی ترکیب تھی، اور وہ..... "فرار" ـ!

گھر میں سب لوگ بیاہ کی تیاری کر رہے تھے۔ منوہر کی بوڑھی دادی یا تو پلنگ پر پڑی رہتی تھیں اور اب پوتے کی بیاہ کی خوشی نے اُن کے پر لگا دیئے ایک ایک چیز کو دیکھتیں بات بات میں مشورہ دیتیں کہ ایسا ہونا چاہیے یہ چیز مناسب ہے۔ یہ بات ٹھیک رہے گی، منوہر گھر والوں کے اس شوقِ مسرت کو دیکھ کر دل ہی دل میں کُڑھتا تھا۔ اُس غریب کے دُکھ درد سے سب لوگ بے خبر تھے۔ لیکن اس میں گھر والوں کا بھی کیا قصور تھا بیٹے کی شادی کی سب کو خوشی ہوتی ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ جس کے بیاہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور جس کے لئے یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا وہ کسی غیر معمولی حادثہ کے سبب اس تقریب سے بیزار تھا۔

منوہر نے اس مسئلہ میں کسی دوست کو بھی رازدار بنانا مناسب نہ سمجھا، شادی سے دو ہفتہ پہلے گھر سے کچھ رُوپیہ پیسہ لیکر وہ فرار ہو گیا، منوہر کا اس طرح اطلاع دیئے بغیر ایکا ایکی گھر سے باہر چلا جانا گھر والوں کے لئے باعثِ تشویش تھا دو چار دن تک وہ اس خیال میں رہے کہ منوہر کسی یار دوست کے ساتھ تفریح کے لئے چلا گیا ہوگا۔ لیکن جب پورا ایک ہفتہ گذر گیا اور منوہر کی کوئی خیر خبر نہ ملی تو وہ بہت متفکر ہوئے اور منوہر کی تلاش شروع ہوئی۔ شہر شہر آدمی دوڑائے گئے، جگہ جگہ تار بھیجے گئے مگر منوہر کا پتہ نہ چلا' منوہر کے باپ بیٹے کے غم میں نیم پاگل سے ہو گئے تھے اور اس کی بوڑھی دادی یا تو پوتے کے بیاہ کی خوشی میں دوڑی پھرتی اور اب چار ہی دن میں پلنگ سے لگ گئی۔ شادی مُلتوی ہو گئی اور مُلتوی کیوں نہ ہوتی دولھا ہی غائب تھا۔ دولھا نہ ہو تو بیاہ کیسا!

منوہر کی گمشدگی ایک ناقابلِ حل معمہ بنی ہوئی تھی اُس کے لنگوٹیے یار اور گہرے دوست تک حیران تھے کہ یہ کیا ہوا سب لوگ اپنی بساط اور عقل کے موافق طرح طرح کی رائے زنی کرتے تھے مگر اصل بھید سے سب بے خبر تھے۔ منوہر سب کو تاریکی میں چھوڑ کر فرار ہو گیا وہ چاہتا بھی یہی تھا کہ کسی کو اُس کے دُکھ کی خبر بھی نہ ہو اور شادی کسی طرح ٹل جائے۔

منوہر مکان سے بھاگ کر چند دن اِدھر اُدھر شہروں میں گھومتا رہا اور ایک ماہ کے بعد سرلا پور کی دھرم شالہ میں ٹھیر گیا اُس کا مقصد چند دن باہر رہنا تھا کہ لڑکی والے جب یہ خبر سنیں گے کہ لڑکا غائب ہو گیا تو وہ لڑکی کے بیاہ کی کہیں اور فکر کریں گے اور اس طرح بات بھی نہ کھلے گی اور یہ بلا بھی اس کے سر سے ٹل جائے گی —— دھرم شالہ میں سادھوؤں اور جٹا دھاریوں کا جمگھٹا رہتا اور منوہر دل بہلانے کے لئے ان کے ساتھ گفتگو کرتا۔ سادھو لوگ عجیب عجیب قصے سُناتے، منوہر کے لئے اتنی دلچسپی بہت کافی تھی کیونکہ اُسے تو کسی طرح وقت گذاری کرنی تھی اور وقت گذاری کے لئے سادھوؤں کا ساتھ بڑا ہی دلچسپ اور پُر لطف تھا۔

منوہر ایک دن بازار سے گذر رہا تھا اُس نے دیکھا کہ سڑک کے نکڑ پر اُس کا ملازم پرشوتم اور اُس کا چچا زاد بھائی ہرلش دونوں کھڑے ہوئے راہ گیروں کو دیکھ رہے ہیں، منوہر بازار کی ایک گلی سے نکل کر دھرم شالہ کی طرف چلا آیا، اس واقعہ کے ایک ماہ کے بعد اُس نے اپنے اور دو تین عزیزوں کو بازار میں گھومتے ہوئے دیکھا منوہر کو یقین ہو گیا کہ یہ اُس کی تلاش میں آئے ہیں اور وہ ڈھونڈنے والوں کی نگاہ سے بچ نہیں سکتا۔ گھر سے آئے ہوئے اُسے چھ مہینے ہو چکے تھے وہ چند ماہ اور گھر

سے دُور رہنا چاہتا تھا کہ شادی کی بات۔ اتنے دن میں دب جائے گی اور لڑکی والے اپنی لذت چشیدہ کنواری لڑکی کی کسی دوسری جگہ بات ٹھیرالیں گے۔

منوہر گھر سے جو روپیہ لایا تھا وہ ختم ہو چکا تھا کچھ دن تو اُس نے اپنی انگوٹھی بیچ کر گذارے اب اس کے پاس چند ہی دن کا مسالہ رہ گیا تھا۔ دھرم شالہ میں سادھوؤں کے ساتھ رہ کر بھی گذر ہو سکتی تھی۔ مگر اس کی غیرت کو خیرات اور پن کے ٹکڑوں پر زندگی بسر کرنا کسی طرح گوارا نہ تھی۔ منوہر کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی لیکن وہ گھر واپس جانے کے لئے ابھی تیار نہ تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہیئے۔ سوچتے سوچتے وہ مُسکرایا اور بہت دیر تک ہنستا رہا۔ اُس کا فیصلہ شاید انوکھا اور عجیب سا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ خود ہی کہنے لگا:۔

"ہاں! ہاں! جیلخانہ — !کیا بُرائی ہے کچھ دن وہاں کی دنیا بھی دیکھ لیں گے، ایک تجربہ یہ بھی سہی۔! اور مجھے تو چند دن گھر سے باہر رہنا ہے...... !جیلخانہ سب سے اچھی جگہ ہے۔ اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ لڑکی والوں کو میرے جیلخانہ جانے کا حال معلوم ہو گیا تو اپنی لڑکی کا رشتہ میرے ساتھ کیوں کرنے لگے ......

ہر طرح میری ہی جیت ہے......!"

دس پانچ دن کے کھانے پینے کا تو منوہر کے پاس سہارا تھا مگر وہ جلد سے جلد اپنی سوچی ہوئی تجویز کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ کسی آدمی کو گالی دے کر اور زخمی کر کے بھی وہ جیلخانہ جا سکتا تھا لیکن اس دل آزارانہ اقدام کے لئے وہ تیار نہ تھا۔ جیل خانہ کی خواہش منوہر سے دار داتیں کرانے لگی...... مگر پُر لطف واردا تیں

بہت ہی کم تکلیف دہ —— ! وارداتیں نہیں دلچسپ مذاق —— ! پولیس کے تھانے میں کئی وارداتوں کی رپٹ لکھوائی گئی جنکو پڑھ کر اور سنکر پولیس والے اور دوسرے لوگ ہنسنے لگے یعنی کئی مکانوں میں چور داخل ہوا، قیمتی مال و اسباب گھر میں موجود تھا مگر گیا کیا ؟ پھٹے ہوئے جوتے، دوا کی خالی شیشیاں، سائیکلوں کے ناقابلِ استعمال ٹائر ! شہر میں بھی اس کے چرچے ہونے لگے کہ یہ کوئی خوش مزاج اور مذاقیہ چور ہی جو روپیہ پیسہ کو ہاتھ تک نہیں لگاتا اور ناکارہ چیزیں چُرا کر لے جاتا ہے پولیس کے یہاں بہر حال چوری کی اطلاعات آرہی تھیں اور چوری ایک روپیہ کی ہو یا لاکھ روپیہ کی یہ بہر حال چوری ہی، جس گھر سے دوا کی خالی شیشی کی چوری ہو سکتی ہے وہاں سے اشرفیوں اور موتیوں کا ڈبہ بھی چرایا جا سکتا ہی

منوہر تو جان بُوجھ کر ایسا کر رہا تھا اُس نے پولیس کو اپنے گرفتار کئے جانیکا موقعہ دیا، گرفتاری عمل میں آئی اور دھرم شالہ کی کوٹھری سے جس میں منوہر رہتا تھا بہت سی چیزیں برآمد ہوئیں، مجسٹریٹ کے سامنے چالان پیش ہوا، برآمد شدہ مال پر جب مجسٹریٹ نے نظر ڈالی تو وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

—— یہ تم نے چُرایا کیا ہے —— ؟ پاگل معلوم ہوتے ہو تم —— ! ٹوٹی ہوئی چلمیں، دوا کی خالی شیشیاں، شکستہ جُوتے، پھٹے ہوئے پاجامے، ٹوٹے ہوئے پیپے —— ! ردّی کی ٹوکری —— ! مٹّی کے کھلونے —— ! یہ معاملہ کیا ہی ! مجسٹریٹ نے منوہر سے کہا۔

—— مجھے اسی قسم کی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہی —— منوہر نے سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔

——— تو چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی، ایسی ناکارہ چیزیں یوں ہی مل سکتی تھیں ——— مجسٹریٹ بولا۔

——— اسی بات کا تو سارا رونا ہے کہ لوگ ناکارہ چیزیں مفت نہیں دیتے، یہ دنیا بڑی لوبھی اور خود غرض ہے مجسٹریٹ صاحب! ایک ٹوکری مٹی کوئی مفت نہیں دیتا ——— ! منوہر نے جواب دیا اور پولیس کا ہیڈ کانسٹیبل منوہر کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، جمعدار نے جیب سے اخبار کا تراشہ نکالا، اخبار میں لکھی ہوئی عبارت کے لفظ پڑھتا اور منوہر کے چہرے کو دیکھتا، یہ منوہر کی گمشدگی کا اشتہار تھا، پولیس کے کانسٹبل کو اطمینان ہو گیا کہ ملزم ہی کا حلیہ ہے اس نے مجسٹریٹ کے روبرو اخبار کا تراشہ پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے پیش کئے ہوئے اخبار کو پڑھا، منوہر کو غور سے دیکھا اور حکم دیا کہ ملزم کے باپ کو نوٹس دے کر طلب کیا جائے اور ملزم اس وقت تک حوالات میں رہے۔

منوہر کے باپ کو نوٹس ملا، بیٹے کے مل جانے کی اطلاع سنکر وہ خوشی کے مارے اچھل پڑا لیکن اس خوشی میں دل گرفتگی بھی شامل تھی، نوٹس میں لکھا تھا کہ "منوہر ملزم" کے مقدمہ میں منوہر کے باپ کو طلب کیا گیا ہے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، یہ آنسو خوشی اور غم کے ملے جُلے آنسو تھے، پیشی کی تاریخ بہت ہی قریب رکھی گئی تھی وہ پیشی سے بہت پہلے سرلا پور پہنچ گیا، بیٹے سے حوالات میں ملا، باپ بیٹے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر آبدیدہ ہوئے وکیلوں کے ذریعے ضمانت کی درخواست پیش کرکے منوہر کو ضمانت پر چھڑایا گیا۔

——— منوہر یہ تم نے کیا کیا؟ ——— منوہر کے باپ نے پوچھا

پتاجی! آپ ناراض اور رنجیدہ نہ ہوں میں نے کوئی جرم نہیں کیا یہ صرف
ایک ڈرامہ ہی۔
اور ہاں ۔ ! میرے بیاہ کا کیا رہا وہ بلا ٹلی یا نہیں ———— منوہر
نے جواب میں کہا۔
منوہر کے باپ نادان نہ تھے یہ بات سنکر کہ " بیاہ کا کیا رہا وہ بلا ٹلی یا نہیں"
ان کا ماتھا ٹھنکا کہ منوہر نے حوالات سے چھُٹنے کے بعد نہ تو گھر کی خیر خبر پوچھی نہ کوئی
اور ذکر کیا سب سے پہلے بیاہ کا ذکر نکالا اور وہ بھی اس طرح کہ " وہ بلا ٹلی یا نہیں"۔!
منوہر کے باپ خاموش ہو گئے، بات کی تہ میں جانے اور اور بھید معلوم کرنے کا
یہ موقع نہ تھا، سب سے پہلے مقدمہ کا تصفیہ ضروری تھا۔ وکیلوں سے مشورہ
کرنے کے بعد ڈاکٹری سارٹیفکیٹ عدالت میں پیش کرایا گیا کہ ملزم کے دماغ میں
فتور ہی اور ظاہر ہی کہ جو مجرم پھٹے ہوئے جوتوں اور خالی شیشیوں کی چوری کرتا ہو اس
کا دماغ خراب ہونا ہی چاہیئے، پیشی پر مجسٹریٹ نے مقدمہ خارج کر دیا۔ منوہر کے
باپ نے عدالت میں ضمانت داخل کی کہ وہ اپنے پاگل بیٹے کی معقول نگرانی کرے گا۔
منوہر اور اس کا باپ دونوں عدالت کے دروازے سے نکل ہی رہے تھے کہ
تماشائیوں کی ایک بھیڑ نظر آئی، پولیس ایک نوجوان عورت کو حراست میں لئے ہوئے
عدالت کی طرف آ رہی تھی، منوہر کے باپ نے عورت کو دیکھا اور متحیر ہو کر رہ گیا، منوہر
نے تو اس کو ایک نگاہ میں پہچان لیا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے اُس نے تاج محل میں
دیکھا تھا اور جس کے ساتھ اس کے بیاہ کی بات ٹھیرائی گئی تھی، دریافت کرنے پر
معلوم ہوا کہ یہ عورت کان پور سے آ کر سرلا پور کے ہوٹل میں ٹھیری اور دوا کے ذریعہ

حمل گرانے کی کوشش کی اور خفیہ پولیس نے اُسے گرفتار کرلیا۔

——— بیٹا منوہر! جب تجھے سب کچھ معلوم تھا تو مجھ سے صاف صاف کہہ دینا چاہیئے تھا، اِتنا کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی ——— منوہر کے باپ نے کہا۔

——— پتاجی! میں آپ کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ! میری باتوں سے آپ کو دُکھ پہنچا، میں معافی چاہتا ہوں میری بھُول کو معاف کر دیجئے ——— ! منوہر نے کہتے ہوئے باپ کے پیر پکڑ لئے۔

——— منوہر! تونے تو خاندان کی آبرو بچائی، تجھ سے بھُول نہیں ہوئی.... منوہر کے باپ نے بیٹے کے ہاتھوں کو چُوم لیا ——— ! باپ اور بیٹے کی محبت آنسو بن کر ٹپک رہی تھی ——— !

فریب کا انجام

ناصر کا گھرانا معزز اور شریف گھرانا تھا مگر بچپن ہی سے صحبت اُسے آوارہ اور بد معاش لوگوں کی ملی۔ شہر کے لفنگے اور شہدے اس کے دوست تھے، وہ دن بھر آوارہ گردی کرتا، اسے مارا اُس سے لڑا اس کو گالیاں دیں، کسی کو چلتے میں دھکّے دے کر گرا دیا۔ بدمعاشی اور سفلہ پن اس کی فطرت میں رچ گیا تھا، خاندانی شرافت کہاں کہاں ہتھیلی لگاتی اُس کا ماحول ہی انتہائی خراب تھا، جوان ہو کر یہ رنگ اور گہرا ہو گیا، بری عادتیں پختہ ہو چکی تھیں، ناصر سارے شہر میں شیطان کی طرح مشہور تھا، اس کی آوارگی ضرب المثل بن گئی تھی، عورتیں اپنے بچّوں کو غصّہ میں بد دعا دیتے ہوئے کہا کرتی تھیں کہ "تجھ پر ناصر کا سایہ پڑے"! شریف لوگ اس سے ملتے ہوئے کتراتے بھی تھے اور ڈرتے بھی تھے۔ ناصر اپنی عزّت گنوا چُکا تھا۔ دوسرے کی عزّت آبرو کا اسے کوئی پاس ہی نہ تھا، بے عزّت اور آبرو باختہ کی ایک گالی میں شریف کی عزّت خاک میں مل جاتی ہے اس بے آبروئی کی شہرت نے ناصر کو اور مغرور بنا دیا تھا وہ خوش تھا کہ شہر میں اس کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے اور وہ بڑے سے بڑے آدمی کی عزت خاک میں ملا سکتا ہے۔

محلہ کے ایک بنیئے کے یہاں باہر سے بارات آئی، محلہ کے بہت سے لوگوں کو دعوت میں بُلایا گیا، ناصر کو جب خبر ہوئی کہ بنیئے نے اُسے بارات میں بُلاوا نہیں بھیجا تو اُس نے اپنے آوارہ دوستوں کو اکٹھا کرکے عین اُس وقت جبکہ بارات کی محفلِ رقص و سرود شباب پر تھی بنیئے کے مکان پر ڈھیلے پھنکوائے، جلسہ گاہ کے شامیانہ پر ڈھیلوں کا مینہ برسنے لگا، محفل میں بھاگڑ مچ گئی، کوئی کہتا بھاڈا کے والے چڑھ آئے کہیں سے آواز آئی کہ ہندو مُسلم فساد ہو گیا، کئی آدمی بھاگتے میں زخمی ہو گئے، طوائفوں کا تو ڈر کے مارے یہ حال تھا کہ سازندوں سے چمٹی جاتی تھیں کہ خدا کے لئے ہمیں بچاؤ اور ان کے سازندے اپنے بچاؤ کے لئے اہلِ محفل کی پناہ ڈھونڈتے تھے کتنے ہی طبلے بیکار ہو گئے۔ سارنگیوں کے تاروں کی دھجیاں اُڑ گئیں، صبح کو معلوم ہوا کہ ناصر اور اس کی پارٹی نے بنیئے سے انتقام لیا تھا، لوگوں نے بنیئے سے کہا کہ پولس میں رپٹ کرا دو، لالہ جی بولے بھیا! میں پولیس کے تھانہ میں قدم بھی نہ رکھوں گا جو ہونا تھا سو ہو گیا ذرا بارات رخصت ہو جائے تو میں ناصر میاں کے پیروں میں ٹوپی ڈالدونگا کہ میری خطا معاف کر دو، مجھے اس شہر میں رہنا ہے، پولیس کہاں کہاں میرا ساتھ دیگی، اُس دن سے شہر میں جس کسی کے یہاں بھی کوئی تقریب ہوتی ناصر کو ضرور بُلایا جاتا، ناچ گانے کی محفلوں میں ناصر صدرِ محفل بن کر بیٹھتا اور یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اور عزت تھی۔

ناصر بچپن ہی سے ذہین تھا لیکن اُس کی ذہانت بُرے کاموں میں صَرف ہوتی تھی۔ ذہانت کا حال تلوار جیسا ہے کہ اُس سے اپنی حفاظت بھی ہو سکتی ہے اور کسی کا دماغ خراب ہو جائے تو خود اپنا گلا بھی کاٹا جا سکتا ہے۔ کام بُرا ہو یا اچھا ذہانت

دونوں جگہ اپنے اثرات ظاہر کرکے رہے گی، ناصر طرح طرح سے روپیہ پیدا کرتا تھا۔ مگر جو روپیہ مکر و فریب سے حاصل کیا جاتا ہے اُس کو قرار نہیں ہوتا اس ہاتھ آیا اور اُس ہاتھ چلا، ناصر کی ذہانت نے اُسے ایک تدبیر سجھائی، اس نے اخباروں میں اشتہار دیا کہ گرمی میں کھانا کھاتے وقت موذی مکھیاں بہت ستاتی ہیں اور کھانا کھانے والے ان سے تنگ آجاتے ہیں جو لوگ کھانا کھاتے ہیں مکھیوں سے بچنا چاہیں وہ صرف دو آنہ کا ٹکٹ میرے پاس بھیجدیں اُن کو ترکیب بتا دی جائے گی ۔!

اس اشتہار کو دیکھ کر ہزاروں آدمیوں نے ناصر کے پاس ٹکٹ بھیجدیئے جب ناصر نے دیکھا کہ بہت کافی ٹکٹ وصول ہو چکے تو اُس نے اخبار میں یہ مضمون شائع کرا دیا کہ جن لوگوں نے میرے پاس مکھیاں اڑنے کی تدبیر معلوم کرنے کے لئے ٹکٹ ارسال فرمائے ہیں اُن کی خدمت میں عرض ہے کہ فرداً فرداً جواب دینا میرے لئے ناممکن ہے اس لئے آگاہی عوام کے لئے اخبار کے ذریعہ مطلع کیا جاتا ہے کہ کھانا کھاتے وقت پنکھا یا رومال ہاتھ میں لے لو اور پنکھے یا رومال کو ہلاتے جاؤ، مکھیاں انشاء اللہ اُڑ جائیں گی ۔!

اس مضمون کو پڑھکر لوگ خوب ہنسے کہ اس ناصر نے ساری دنیا کو بیوقوف بنا دیا مگر اس کی ذہانت کی سب نے تعریف کی، دو ایک صاحبوں نے اسکے خلاف مقدمہ دائر کر دیا لیکن مقدمہ خارج ہو گیا۔ ناصر کے وکیل نے عدالت سے کہا کہ مدعا علیہ نے مکھیاں اُڑانے کی ترکیب بتانے کا وعدہ کیا تھا سو وہ اُس نے پورا کر دیا اُس نے نہ کسی کو دھوکا دیا اور نہ خلاف معاہدہ کوئی بات کی ۔!

ناصر کی ناجائز تمناؤں اور بڑھتی ہوئی خواہشوں کے لئے اُس کے وطن میں

اب گنجائش ہی نہ رہی تھی، وہ بدمعاشی اور فریب کا ہر کھیل وہاں کھیل چکا تھا، ناصر لاکھ بدمعاش اور آوارہ سہی پھر بھی وطن والوں کے سامنے آنکھ جھک ہی جاتی تھی اور مکر و فریب کی دنیا میں مروت اور شرما حضوری سے کام نہیں چلتا، دھوکا اور بدمعاشی تو ایسے آدمی کو چاہتی ہے جس کی آنکھ میں نہ شرم ہو اور نہ مروت! جو ضرورت اور مصلحت کے وقت دشمن کے پیر چھوئے اور موقعہ پڑے تو بھائی کے گلے پر چھری پھیر دے۔ شہر میں ناصر کے مخالف بھی ہو گئے تھے! پولیس بھی اس کی فکر میں تھی اُس نے یہ رنگ دیکھکر شہر چھوڑ دیا، تھوڑا بہت جادو، نظر بندی، ہت پھیری کے چٹکلے اُسے یاد تھے وہ سیدھا کلکتہ پہنچا، وہاں اتّفاق سے نمائش ہو رہی تھی، ناصر نے نمائش میں ایک جگہ کرایہ پر لے لی اور شامیانہ اور خیمے لگا کر پنڈال کھڑا کر دیا، اُس نے اخباروں میں اشتہار دیا کہ فنِ طلسمات کا پروفیسر کلکتہ میں آیا ہوا ہے صرف ایک دن اس کا کھیل ہوگا، پبلک اس کے کھیل کو دیکھکر متحیر ہو جائے گی۔

پروپیگنڈے میں تو وہ زور ہے کہ ایک طفل مکتب کو آپ علامہ بنا سکتے ہیں اس دنیا میں پروپیگنڈے کی بدولت کیا کچھ نہیں ہو رہا ہے۔ ناصر کے کھیل کی پبلسٹی بہت کافی ہوئی، کھیل والے دن پبلک اس قدر کثیر تعداد میں آئی کہ کھیل شروع ہونے سے بہت پہلے پنڈال کھچا کھچ بھر گیا، پبلک کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ روپیہ والا ٹکٹ چار چار پانچ پانچ روپیہ میں فروخت ہوا، اس اطلاع نے لوگوں کو اور مشتاق بنا دیا کہ نمائش ایک مہینہ تک رہے گی مگر یہ پروفیسر صاحب صرف ایک دن اپنا کھیل دکھا کر چلے جائیں گے۔ کھیل شروع ہونے کا وقت دس بجے تھا مگر گیارہ بج گئے اور اسٹیج کے پردے کو بھی جنبش تک نہیں ہوتی۔ پبلک نے شور مچانا شروع کر دیا سیٹیاں

بجنے لگیں یہاں تک کہ ساڑھے گیارہ ہو گئے، اب سنجیدہ سے سنجیدہ لوگ بھی ملّاحیاں سنانے لگے، پونے بارہ بجے پردہ اُٹھا، ناصر سیاہ لباس میں نمودار ہوا اور خوب زور سے بولا :-

—— سخت افسوس ہے کہ آپ لوگ وقت سے پہلے کھیل دیکھنا چاہتے ہیں اور ناحق شور مچا رہے ہیں۔

اس پر مجمع سے آوازیں آئیں :-

—— پونے بارہ بجے ہیں اس وقت۔! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ — ! واہ۔!

اس جواب پر ناصر مُسکرایا اُس کی مُسکراہٹ نے مجمع کو اور آتش زیر پا کر دیا، اُس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور نرمی کے ساتھ بولا :-

—— ذرا اپنی گھڑیوں کو تو دیکھئے۔

سینکڑوں آدمیوں کے پاس گھڑیاں موجود تھیں، لوگوں نے گھڑیوں پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ سب کی گھڑیوں میں پونے دس بجے کا وقت ہے۔

ناصر نے گردن جُھکا کر مجمع کو سلام کیا اور بولا :-

—— کھیل ہو چکا —— ! آپ کا شکریہ —— !

ادھر ناصر کی گردن خم ہوئی اور اُدھر اسٹیج کا اُٹھا ہوا پردہ گر گیا، پبلک نے خوش ہو کر تالیاں بجائیں اور سارے شہر میں ناصر کے کھیل کے چرچے ہونے لگے۔ ناصر اسی کرتب اور نظر بندی سے بہت کچھ روپیہ پیدا کر سکتا تھا مگر اس نے پھر کبھی اس کھیل کو نہیں دُہرایا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ بنگال کے ایک بہت بڑے جادوگر نے ناصر کو صرف ایک مرتبہ ایسا کرنے کی اجازت دی ہے اُس کے بعد اگر ناصر کوشش بھی

کرے گا تو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ اُلٹا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو حقیقت چاہے کچھ ہو لیکن ناصر نے بہر حال اس دن کے بعد پھر اس کھیل کو نہیں دُہرایا۔

ناصر کچھ دن تو اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ اس عرصہ میں اُس نے مستقبل کی کسی سوچی ہوئی اسکیم کے لئے ڈاڑھی بھی رکھ لی، آدمی وجیہ تھا ڈاڑھی کے بعد چہرہ اور بھی مقدس نما ہو گیا۔ بمبئی اور سورت کا چکر کاٹ کر وہ سندھ کے ایک مالدار قصبہ میں پہنچا اور مسجد کے ایک شکستہ حجرے میں رہنے لگا، لوگوں نے یہ سمجھ کر کہ کوئی غریب مسافر کہیں سے آگیا ہے اس کی امداد کرنی چاہی مگر ناصر نے انکار کر دیا کہ میں اپنے ہاتھ سے کما کر کھانے کا قائل ہوں، دوسروں کی امداد نہیں چاہتا۔ ناصر جاہل نہ تھا پڑھا لکھا تھا مگر یہاں آکر وہ بالکل جاہل اوران پڑھ بن گیا اور اس انداز میں گفتگو کرتا گویا کہ اس کا شین قاف بھی درست نہیں ہے اور کتاب کی تو اُسے ہوا بھی نہیں لگی مسجد کے مُلّا سے وہ نماز کی دُعائیں پوچھتا اور لوگوں کے دکھانے کے لیے ایک ایک آیت کو دن بھر یاد کرتا اور دوسرے دن پھر بھول جاتا۔ اس کی کُند ذہنی اور گنوار پن پر لوگ ہنستے تھے۔ محلّہ میں لکڑیوں کی ٹال تھی وہ دن میں دو تین گھنٹے ٹال میں جا کر کام کرتا اور مزدوری سے اپنا پیٹ پالتا، لوگوں کو اُس نے اپنا نام حُسّن بنایا تھا اور قصبہ میں وہ حُسّن شاہ کے نام سے مشہور تھا۔

ناصر اپنی جہالت اور ان پڑھ ہونے کے ثبوت میں لوگوں سے عجیب و غریب باتیں کرتا، اُس کی جاہلانہ مگر فریب کارانہ باتیں :۔

کیوں جی! مدینہ سریپ (شریف) میں جو کعبہ کی مسجد (مسجد) ہے وہ

کتنی بڑی ہے۔

لوگوں نے اس پر قہقہہ لگایا کہ کعبہ مدینہ شریف میں نہیں مکہ میں ہے۔

کلکتہ میں جناجے (جنازے) کی نماج (نماز) ہو رہی تھی میں بھی شامل ہو گیا (شامل)، مگر سردے (سجدے) میں پہنچکر میرا وجو (وضو) ٹوٹ گیا۔

سُننے والے ہنس کر بولے جمن شاہ! تم تو نرے پاگل ہو، جنازے کی نماز میں سجدہ کلکتہ والے کرتے ہوں گے۔

میں نے ایک ملّاجی کی جُبانی (زبانی) سُنا ہے کہ روجے (روزے) میں حُقّہ پینے سے روجا (روزہ) نہیں ٹوٹتا۔

ناصر کی ان باتوں پر لوگ خوب ہنستے، ناصر کی اس سادہ لوحی نے اُسے قصبہ میں مشہور ہی نہیں کیا بلکہ قدرے ہر دلعزیز بھی بنا دیا۔ کمال ہو یا بے کمالی ہر انوکھی بات لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی ہے! ناصر اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا تھا اور آخری کامیابی کا وقت آچکا تھا۔

بقرعید کی صبح کو جماعت کے لئے لوگ مسجد میں کھڑے ہوئے پیش امام مصلے پر بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ ناصر نے اُسے روک دیا اور خود مُصلّے پر کھڑے ہو کر نہایت خوش الحانی کے ساتھ نماز پڑھائی، سلام پھیرا تو لوگ متحیّر تھے کہ اس کا تو شین قاف بھی درست نہ تھا، کل تک تو چھوٹی چھوٹی سورتیں پڑھتے ہوئے زبان ٹھوکریں کھاتی تھی ایک ہی رات میں کیا معجزہ ہو گیا۔

ناصر نے کہا:۔

"مُسلمانو! تمہاری حیرت نامناسب نہیں ہے! مگر اللہ کے فضل کی کوئی حد

نہیں ہے وہ اپنے جس بندے کو جب چاہے نواز دے، رات خواب میں ایک سفید پوش بزرگ تشریف لائے اور اپنا لعابِ دہن میری زبان سے لگا دیا، یہ جو کچھ تم دیکھ رہے ہو اُسی کا اثر ہے۔"

ناصر کا یہ کہنا تھا کہ لوگ اُس پر ٹوٹ ہی تو پڑے، کوئی ہاتھ چومنے لگا کسی نے پیر پکڑ لئے۔ کتنے ہی بوڑھے آدمی تو اس سے بغلگیر ہو کر رونے لگے، تمام قصبہ میں بجلی کی طرح یہ خبر دوڑ گئی اور مسجد میں تماشائیوں اور عقیدت مندوں کا میلہ لگ گیا ناصر تو حرفوں کا بنا ہوا تھا۔ لوگوں کی بے پناہ عقیدت کو دیکھ کر اس نے آنکھیں جھکالی تھیں کہ اتنا کچھ فضل ہو جانے کے بعد بھی وہ مغرور نہیں ہے۔ بقر عید کی نماز بھی ناصر ہی سے پڑھوائی گئی، نماز کے بعد جو ناصر کی دست بوسی ہوئی ہے تو دوپہر ہو گئی۔ عقیدت کے جوش میں لوگ قابو سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ریاکار ناصر نے اسکیم ہی ایسی کامیاب بنائی تھی کہ کسی بدگمانی اور شبہ کا کوئی موقعہ نہ تھا۔

ناصر مسجد کے شکستہ حجرے میں رہتا تھا اور اب اس واقعہ کے بعد شہر کے سب سے بڑے مسلمان امیر نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا کہ غریب خانہ حاضر ہے۔ ناصر نے امیر کی درخواست کو منظور کر لیا اور اس کے مکان میں منتقل ہو گیا۔ یہ مکان ناصر کے لئے مخصوص کر دیا گیا اور اس پر تختی لگا دی گئی:-

"قیام گاہ حضرت شیخ طریقت موردِ فضل الٰہی دستگیر بیکساں
قبلہ حسن شاہ مدظلہ العالی"

اس مکان میں ہر طرح کا آرام تھا، وسیع و فراخ کمرے، پلنگ، مسہری، تخت، قالین گاؤ تکیے، جھاڑ، فانوس ایک چھوڑ چار چار نوکر اور نوکروں کی ناصر کو ضرورت ہی کیا تھی

سارا شہر اس کا غلام تھا۔ لوگ اُس کی خدمت کرنے کو ذریعہ سعادت اور موجب نجات سمجھتے تھے۔ آس پاس کے علاقہ میں بھی اس واقعہ کی کافی شہرت ہوگئی اور یار لوگوں نے اس واقعہ کو اور بڑھا چڑھا کر بیان کیا ناصر کی ذات مرجعِ عوام و خواص بن گئی تھی۔ اب اس پر چڑھاوا چڑھنے لگا، لوگ تحفے اور ہدیے لیکر آتے، ناصر یہ کہہ کر کہ ہم اس قصبہ میں ایک بڑی خانقاہ بنوانے والے ہیں جہاں ہمارے پیرو مرشد کا عُرس ہوا کرے گا، نذرانوں کو قبول کر لیتا۔ ناصر کی چاندی ہی چاندی تھی، مُرغن کھانے بیش قیمت تحفے، مسلمانوں کا جوشِ عقیدت غرض ہر چیز اس کے لئے موجود تھی۔

ایک دن قصبہ کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان ناصر کے پاس آیا اور دو زانو ادب سے بیٹھ کر بولا:۔

——— حضور! اخبار والے آپکے حالات چھاپنا چاہتے ہیں اور انکا بہت اصرار ہے۔

اس پر ناصر بولا:۔

فقیر کے حالات کیا——! ابتدا اللہ انتہا اللہ——! حیات اللہ موت اللہ——! ارے! بچے اپنے اخبار والوں سے کہہ دے کہ وہ حال و مقام کے جھگڑے میں نہ پڑیں——!

ناصر کے اس جواب پر عقیدت مند جھومنے لگے اور وہ نوجوان تو کانپنے لگا۔

ناصر کے مزے آ رہے تھے، شہر کی عورتیں بھی اُس کے یہاں آنے لگیں، بلکہ حاضر ہونے لگیں۔ ذوقِ نظارہ کی جو کسر رہ گئی تھی وہ اس طرح پُوری ہو گئی، شروع شروع میں تو ناصر نے احتیاط برتی مگر خلوت میں حسین عورتوں کی قربت میسّر ہونے پر احتیاط کے بند آہستہ آہستہ ڈھیلے ہونے لگے، ناصر نے لوگوں کے دکھانے اور

اعتماد پیدا کرنے کے لئے محتاط روش اختیار کی تھی ورنہ وہ تو ان لوگوں میں تھا جو سر بازار عورتوں کو چھیڑ کر گالیاں کھاتے ہیں۔ شہر میں ہر طرح کی عورتیں تھیں، ناصر بڑا مزاج شناس تھا عورتوں کے تیور اور مزاج کو دیکھ کر دست درازی کرتا۔ جہاں دیکھا کہ کوئی عورت بہت زیادہ محتاط ہی تو تصوف آمیز باتیں شروع کر دیں اور جو کسی کو ذرا نرم پایا تو ہنسی مذاق ہونے لگا۔ ناصر کے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ کو عورتیں اویعرد جذب و محبت پر محمول کرتے تھے، اتنے مقدس اور خدا رسیدہ انسان سے کسی ہوسناک لغزش کا وہ تصور بھی نہ کر سکتے تھے۔

انور کے باپ ناصر کے بہت معتقد تھے وہ بھی اپنے والد کے ساتھ ناصر کے یہاں آیا جایا کرتا تھا۔ نہ جانے کیوں ناصر کی باتوں نے انور کو کبھی متاثر نہیں کیا باپ کے اصرار پر وہ ناصر کے پاس چلا آتا، انور کے والد شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے وقت انور سے کہتے :-

"حضور کے پاؤں چوم، سر جھکا"!

لیکن انور نے نہ تو ناصر کے پاؤں چومے نہ اس کے سامنے سر جھکایا بس مصافحہ کر لیا ناصر اس پر کہتا :-

——— بچہ ہے ——! ابھی شرماتا ہی ——! اس کا ہمارے یہاں حاضر ہونا ہی کافی ہے ——

انور کے باپ خوش اور مطمئن ہو جاتے کہ ان کے بیٹے کی بے ادبی کا شاہ صاحب نے کوئی اثر نہیں لیا۔

ایک دن انور کے گھر کی عورتیں ناصر کے پاس آئی ہوئی تھیں۔ عورتوں کے لئے

اندر کے دالان میں پردے کا یا یوں کہیے کہ خلوت کا انتظام تھا۔ انور اور دوسرے لوگوں کے ساتھ باہر کی نشست میں بیٹھا ہوا تھا اور ناصر اندر تھا۔ ناصر کو عورتوں کے پاس کافی دیر ہو گئی۔ انور کسی ضرورت سے باہر نکلا۔ باہر جانے کا راستہ بیچ کے کمرے میں ہو کر تھا اور بیچ کا کمرہ اور عورتوں کا دالان ملا ہوا تھا، کمرے کی کھڑکی اتفاق سے آدھی کھلی ہوئی تھی۔ انور نے دیکھا کہ ناصر اس کی بہن کو رخسانے کو تعویذ دے رہا ہے اور اس کی بہن بھی جا رہی ہو، ناصر سے نہ رہا گیا اس نے آواز دی:-

— رشیدہ! مکان کب چلو گی، ڈولی والے شور مچا رہے ہیں -!

اس کی بہن بھائی کی آواز سنکر دروازے کے پاس آئی۔ انور نے دیکھا کہ اس کی بہن کی سانس چڑھی ہوئی ہو اور آنکھیں کچھ گھبرائی ہوئی سی ہیں، رشیدہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ ناصر ہزار دانہ تسبیح لئے ہوئے دروازے پر آگیا اور نہایت متانت کے ساتھ کہنے لگا:-

— میں نے دو تعویذ تو لکھ دئے ہیں بس ذرا پانی پڑھنا باقی رہ گیا ہے!

پانی تو خیر میں مردانہ میں بیٹھ کر پڑھ دوں گا، پھر یہ لوگ جا سکتے ہیں:

ناصر نے مردانے میں قدم رکھا ہی تھا کہ عقیدت مند ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ ناصر نے مسند پر بیٹھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کیا اور اہل محفل باادب بیٹھ گئے۔ ناصر نے آنکھیں بند کر کے کچھ پڑھا اور پانی پھونک کر انور کو دیدیا۔ انور اپنے گھر کی عورتوں کو لیکر مکان چلا گیا۔

انور کے دل میں پہلے ہی سے ناصر کی طرف سے کچھ کھٹک سی تھی اس واقعہ

کے بعد تو اس کی یہ خلش شدید بدگمانی سے بدل گئی اور دوسرے گھروں کی عورتوں کے ذریعے اُس نے واقعات کی ٹوہ لگانی شروع کی تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت جُمن شاہ قبلہ مدظلہ العالی بہت کچھ کھیل کھیل چکے ہیں، عورتیں شرم کے مارے کچھ نہیں کہتیں اور کہیں بھی تو کس سے کہیں ان کے گھر والے شاہ صاحب کے خلاف ایک حرف بھی نہیں سُن سکتے۔ شاہ صاحب پر اتہام لگانے والی عورتوں کو اُلٹا بدنام کیا جائے گا کہ یہ چال چلن کی کچھ ایسی ویسی معلوم ہوتی ہیں۔ انور نے دبی زبان سے ناصر (شاہ صاحب) پر حرف گیری کی تو لوگ اس کے سر ہو گئے کہ یہ لونڈا بدعقیدہ اور وہابی ہو گیا ہے جو ایسے مقدس، خدا رسیدہ اور فرشتہ صفت صوفی اور اہل اللہ کو بدنام کرتا ہے، اتنے بہت سے آدمی ایک طرف اور بیچارہ انور ایک طرف، اس غریب کا مذاق بن کر رہ گیا۔

انور نے ناصر کی شرارتوں اور ہوسناکیوں کو ختم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا بہن کا واقعہ اُس کے دل پر نقش تھا، انتقام کی آگ اس کے سینہ میں مشتعل ہو چکی تھی اور نوجوان کی آتشِ انتقام یوں ہی نہیں بجھتی اُس کے شعلے کچھ نہ کچھ کر کے رہتے ہیں اس ریاکار شاہ صاحب (ناصر) کی مخالفت کو انور بہت بڑی نیکی سمجھتا تھا اور وہ دل ہی دل میں کڑھتا تھا کہ سینکڑوں ہزاروں آدمی ایک مکار اور نفس پرست کی سچ مچ پوجا کر رہے ہیں۔

ناصر کی ہوسکاری نے اُس غیر اسلامی اور رنگین تصوف کی پناہ لی تھی جہاں ہر بُرائی کی خوبصورت تاویل کی جا سکتی ہے۔ مردوں کی قوالیوں کے بعد طوائفوں کا گانا تک ہونے لگا، اوّل تو کسی کی ناصر سے کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ پڑتی تھی اور کسی نے

جرأت کرکے پوچھا بھی تو ناصر چہرے پر بناوٹی جذب و کیفیت کے آثار پیدا کرتے ہوئے بولا:۔

——— مرد کا گانا ہو یا عورت کا، اہل کے لئے حلال ہے اور نا اہل کے لئے حرام۔!

اور یہ کہکر اُس نے بدن میں کپکپی پیدا کرکے ایک ضرب لگائی اور کہنے لگا:۔

——— میاں! شریعت کے احکام تو زندوں پر ہیں جو مرچکے ہیں اُن پر شریعت کے احکام کا اطلاق ہی نہیں ہوتا ———

ناصر کی خانقاہ میں طوائفوں کا گانا ہونے لگا۔ شہر کے دس پانچ آدمی (ناصر) شاہ صاحب کی اس حرکت سے کبیدہ خاطر ہوئے، مگر ناصر اپنی شاہ صاحبی سے پورے طور پر لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، دو چار آدمیوں کی مخالفت اور ناراضی کی اُسے پروا نہ تھی۔ ناصر سے لوگوں کو عقیدت تو پہلے ہی کی طرح تھی اور طوائفوں کے گانے کے بعد تو شوقین اور رنگین مزاجوں کا اور جمگھٹا رہنے لگا کہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر رہنے سے دین اور دنیا دونوں ملتی ہیں۔ مگر اُس کی بعض حرکتوں سے لوگوں کو ناگواری ہوئی۔ شریف عورتوں سے چھیڑ چھاڑ کے بعض واقعات کو بھی محسوس کیا گیا ——— یہ سب کچھ تھا لیکن ناصر کے تقدس کی گرم بازاری ان ہلکے ہلکے چھینٹوں سے سرد ہونے والی نہ تھی۔

انور پہلے تو اکیلا تھا اب دو چار اُس کے ہم نوا بھی ہو گئے، ان لوگوں نے ناصر کے عقیدت مندوں سے کچھ کہا تو وہ بولے کہ ہم ان سُنی سنائی باتوں پر یقین نہیں رکھتے جب تک آنکھ سے نہ دیکھ لیں گے اُس وقت تک فرشتوں کی گواہی پر بھی ایمان نہ لائیں گے۔ شہر کا اب یہ حال ہو گیا تھا کہ شاہ صاحب (ناصر) کی کرامتوں کے ساتھ

ساتھ ان کی بے اعتدالیوں کا بھی ذکر آجاتا، عقیدت کے طوفان سے کچھ تنکے اب ٹکرانے لگے تھے مگر حقیر اور کم زور تنکے طوفان کا رُخ تو نہیں بدل سکتے۔

انور نے دوستوں سے کہا کہ بھئی! مکر کا جواب مکر سے دیا جائے گا اس مردود شاہ صاحب سے سیدھے سادے مسلمانوں کا پیچھا چھڑانا ہو تو کوئی تدبیر سوچنی چاہیئے زبانی باتوں سے کام نہیں چلے گا۔ شہر کی جو طوائفیں ناصر کی خانقاہ میں گانے کے لئے آتی تھیں اُن میں سے ایک طوائف پر ناصر کی نظر تھی، اس طوائف کا نام یاسمین تھا۔ یاسمین جوان ہی نہیں خوبصورت بھی تھی، گانا تو اسکو آتا نہ تھا مگر ناصر کو موسیقی کی نہیں حُسن اور جوانی کی ضرورت تھی۔ عقیدت مندوں کی اندھی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ وہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی عقیدت کے نشہ میں مست تھے وہ کہتے تھے:۔

"شاہ صاحب قبلہ یاسمین پر توجہ ڈال رہے ہیں، اس طوائف کی قسمت اچھی ہے۔"

شہر میں نئے کوتوال آئے ہوئے تھے، انور کا ان سے یارانہ ہو گیا، انور نے کوتوال سے ناصر کا سارا کچا چھٹا بیان کر دیا، کوتوال نے کہا کہ تم اطمینان رکھو میں اس کی شاہ صاحبی کا قلعہ مسمار کر دوں گا، یہ مکار اب زیادہ دنوں تک لوگوں کو بیوقوف نہیں بنا سکتا۔ ایسے ریاکاروں کی اصلاح و تادیب بھی پولیس کے فرائض میں داخل ہے کوتوال نے یاسمین طوائف کو راضی کیا کہ شاہ صاحب کے ساتھ ذرا توجہ اور بے تکلفی کا برتاؤ کیا جائے، طوائف تو جھوٹے التفات اور بناوٹی توجہ کی پروفیسر ہوتی ہے اسے تو بچپن ہی سے یہی آرٹ سکھایا جاتا ہے، یاسمین کو ناصر جب بھی اپنی خانقاہ میں گانے کے لئے بُلاتا، یاسمین بہت ہی توجہ کے ساتھ پیش آتی۔

ناصر ایک تو پہلے ہی سے متاثر تھا اور اب یاسمین کی اس توجہ اور التفات نے اُسے اور زیادہ گرویدہ کرلیا۔ یاسمین اس آرٹ میں خود ھی مشاق تھی اور اسکی ہدایت اور رہنمائی کے لئے کوتوال صاحب موجود تھے۔ ناصر تنہائی کی تلاش میں تھا مگر اس کی خانقاہ میں عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا تھا اس لئے خلوت کے مواقع میسر نہ تھے۔ یاسمین سے ناصر کی بے تکلفی بڑھنے لگی۔ ناصر نے لوگوں میں مشہور کردیا تھا کہ شاہ صاحب یاسمین پر توجہ ڈال کر اُسے اس قابل بنا دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنے پیشہ سے توبہ کرلے اور دوسری طوائفوں کو راہِ راست پر لے آئے۔ ناصر کے اس کہنے سے کچھ لوگ مطمئن ہوگئے کچھ خاموش رہے اور بعض نے ناک بھوں چڑھا کر کہا کہ شاہ صاحب کچھ رنگین ہوتے جا رہے ہیں۔

یاسمین کا جادو ناصر پر چل چکا تھا، ہوسنا کی زیادہ انتظار کے لئے تیار نہ تھی عورت کا اقدام اچھے اچھوں کے قدم ڈگمگا دیتا ہے اور ناصر نے تو انہی چٹخاروں کے لئے یہ سب کچھ کیا تھا۔ ایک دن ناصر کو خانقاہ میں تنہائی کا تھوڑا سا موقع مل ہی گیا۔

—— یاسمین.... ! میری بیتابی کو سمجھ رہی ہو تم —— ناصر نے کہا

—— حضور ! بندی تو ہر وقت حاضر ہے —— یاسمین شرما کر بولی

مگر اس خانقاہ میں تو میرے مُرید میرا پیچھا نہیں چھوڑتے ..... پھر کیا ہو

—— ! ناصر نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

دیکھئے ! وہ آپ کے مرید آرہے ہیں ..... ! میں آپ کو خط کے ذریعے اطلاع دوں گی ...... اور ...... یاسمین کہہ رہی تھی کہ ناصر کے مرید خانقاہ میں آگئے اور ناصر نے یاسمین کی بات کاٹ کر مریدوں کو سُنانے کے لئے کہنا شروع کیا:۔

——— بیٹی! نگاہ کو پاک رکھ، اس بُری اور گناہ آلود زندگی میں بھی نیکی کو تلاش کر!
اپنے سوا کسی کو نہ دیکھ۔ جو کچھ ہے اپنے ہی میں ہے، باہر کچھ نہیں ہے۔!

مُرید سر ہلانے لگے کہ شاہ صاحب طوائف کے سامنے حقائق و معارف کے دریا بہا رہے ہیں۔

یاسمین نے کوتوال سے کہا کہ شاہ صاحب اس منزل پر آگئے ہیں، کوتوال نے ناصر کو یاسمین سے خط لکھوایا کہ جمعرات کو ایک بجے میں اپنا آدمی آپکے یہاں بھیجوں گی، جاڑوں کا زمانہ ہے لوگ سوتے ہوں گے۔ آپ میرے مکان پر آجائیے یاسمین کے آدمی نے ناصر کو خط لاکر دیا، ناصر نے خط پڑھا، اس کے چہرے پر خوشی دوڑ گئی، مریدوں کا جمگھٹ تھا ناصر تھوڑی دیر خاموش رہا، اور یاسمین کے آدمی سے بولا، جا اُس سے کہنا کہ ایسا ہی ہوگا اور پھر مریدوں کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا:۔

——— میرے پیر و مرشد کی توجہ سے دس طوائفیں صاحب ولایت ہوگئیں، کیا نظر تھی حضرت قبلہ کی! قربان جائیے۔ اگر بندہ بھی ان کا دیکھنے والا ہے، گلاب کے پاس مٹی رہتی ہے تو اُس میں اثر آجاتا ہے میں تو انسان ہوں۔! اس پر ایک عقیدت مند بولا:۔

——— حضور! کیا کوئی خاص بات ظہور میں آئی۔

ناصر نے جواب دیا:۔

——— ایک کی بات دوسرے کو نہیں بتائی جاتی۔!

مُرید ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگے کہ شاہ صاحب جذب کے عالم میں اسرار منکشف فرما رہے ہیں۔!

ناصر کو جمعرات کا بے چینی سے انتظار تھا، یاسمین کی ہم آغوشی کا تصور اُسے بے خود کیے دیتا تھا۔ ناصر کے یہاں ہر جمعرات کو قوالی ہوا کرتی تھی اُس رات میں بھی حسب معمول قوالی ہوئی مگر ناصر نے کہہ دیا تھا کہ آج مجھے ایک خاص عمل پڑھنا ہے اس لئے قوالی کی محفل جلد برخاست کر دی جائے گی لیکن اس رات میں ایک مرید کو جو حال آیا تو وہ ہوش میں آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ تالیاں بجاتا ہے، ناچتا ہے، گھومتا ہے، ناصر سے لپٹ لپٹ کر روتا ہے۔ اہلِ محفل کو تو لُطف آ رہا تھا مگر ناصر کو سخت ناگواری تھی اس کے دل و دماغ پر تو یاسمین چھائی ہوئی تھی۔ بڑی مشکلوں سے اس شخص کا جذب کم ہوا اور قوالی ختم ہوتے ہوتے رات کے دو بج گئے۔ یاسمین کا بھیجا ہوا آدمی آچکا تھا، ناصر نے قوال کو داد دیتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا وہ محفل میں بیٹھ گیا۔

قوالی کی محفل ختم ہوئی تو عقیدت مند حسب معمول ناصر کے ہاتھ پاؤں دبانے لگے، ناصر نے ان لوگوں سے بہ مشکل پیچھا چھڑایا، اُس نے مریدوں سے کہا کہ آج مجھے جنگل میں تنہا جا کر ایک خاص عمل پڑھنا ہے۔ رات کافی بھیگ چکی تھی جاڑے کا موسم تھا، شہر کی گلیاں سنسان پڑی تھیں، جب مُرید خانقاہ سے چلے گئے اور کچھ وہیں سو گئے تو ناصر خانقاہ کے چھوٹے دروازے سے باہر آیا اور یاسمین کے آدمی کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔!

کوتوال، انور اور اس کے دوست شہر کے بعض لوگوں کو مطلع کر چکے تھے کہ آج شاہ صاحب قبلہ کی کرامات تمھیں ہم دکھا کے رہیں گے، سب لوگ اِدھر اُدھر لگے ہوئے تھے۔ یاسمین کے نوکر نے مکان پر پہونچکر دستک دی دروازہ کھلا اور

شاہ صاحب اندر داخل ہو گئے۔ یاسمین کے مکان میں بھی کچھ لوگ چھپے ہوئے تھے کہ وہ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ لیں اور کانوں سے ہر بات سن لیں۔

——— بہت دیر ہو گئی آپ کو، میں کب سے آپ کا انتظار دیکھ رہی ہوں
——— یاسمین نے مسکرا کر کہا۔

——— میں تو اب تک کبھی کا آجاتا مگر ایک میرے نامعقول مرید کو قوالی میں عین وقت پر حال آگیا بس اس میں دیر ہو گئی ——— ناصر نے جواب دیا اور قالین پر بیٹھتے ہی یاسمین کا ہاتھ پکڑ لیا۔

——— یہ آپ کیا کرتے ہیں، شاہ صاحبوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں
——— یاسمین پیچھے ہٹتے ہوئے بولی

——— یاسمین کیسی نادانوں کی سی باتیں کرتی ہو، میں اپنی شاہ صاحبی تو خانقاہ میں لپیٹ کر رکھ آیا، یہاں تو میں حسن و شباب کی بہاریں لوٹنے کے لئے آیا ہوں! یاسمین! قریب آؤ! چار مہینے سے میں تمھارے لئے تڑپ رہا ہوں، تمھاری نشیلی آنکھوں نے مجھ پر جادو کر دیا ہے ——— لاؤ! ان پیمانوں سے کچھ بوندیں مجھے بھی عنایت کر دو ——— ناصر نے آگے سرکتے ہوئے کہا۔

——— کوئی دیکھ لے تو آپکو کیا کہے گا.... شاہ صاحب ——— ! یاسمین بولی

——— یہاں دیکھنے والا تو کوئی نہیں ہے ——— ناصر نے جواب دیا۔

——— خدا تو دیکھ رہا ہے ——— یاسمین سر کا دوپٹہ سنبھالتے ہوئے بولی

——— ارے ظالم! یہ کوئی مذہبی باتیں کرنے کا وقت ہے، اب تو مجھ سے ضبط نہیں ہو سکتا، تم صرف باتیں کئے جاتی ہو ——— ! ناصر نے کہتے ہوئے

یاسمین کو آغوش میں لینے کی کوشش کی ہی تھی کہ قریب کے کمرے سے چھپے ہوئے آدمی نکل آئے اور ادھر مکان کا دروازہ کھلا اور کچھ لوگ باہر سے آگئے۔ اب جو ناصر پر مار پڑی ہے تو سچ مچ صبح ہوگئی، لوگ اسے مارتے مارتے تھک گئے، محلہ میں جاگ ہوگئی اور یاسمین کے مکان میں تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی

ناصر موقع کی تلاش میں تھا، مارنے والے جو ذرا غافل ہوئے تو یاسمین کے مکان سے پوری قوت کیساتھ بھاگا' جان بچانیکے عزم نے اسمیں غیر معمولی قوت پیدا کردی تھی۔ یاسمین کے مکان سے نکل کر وہ حلوائی کی دوکان پر پہونچا ہی تھا کہ میونسپلٹی والے ہاتھوں میں لاٹھیاں لئے ہوئے ایک کتے کا پیچھا کرتے ہوئے آرہے تھے اور شور مچا رہے تھے:۔

بچے رہنا! پاگل کتا ہے۔

اُدھر سے پاگل کتا بھاگا آرہا تھا ادھر سے ناصر دوڑ رہا تھا' کتا ناصر سے ٹکرایا، ناصر سڑک پر گرا اور پاگل کُتا ناصر کے سینہ پر چڑھ گیا' میونسپلٹی والوں نے جیسے تیسے ناصر کو کتے سے چھڑایا کتے کو مارتے ہوئے دو چار ڈنڈے ناصر کے بھی لگ گئے۔! ناصر کو دواخانہ بھجوایا گیا جہاں وہ کتے کی طرح بھونکتے بھونکتے مرگیا۔

اس واقعہ کے بعد سے یاسمین کی دُور دُور شہرت ہوگئی اُس کا روزگار خوب چلنے لگا' لوگ اُسکو "شاہ صاحب والی یاسمین" کہا کرتے تھے، ناصر کی ریاکاری سب پر ظاہر ہوچکی تھی لیکن اب بھی کچھ ایسے اندھے عقیدتمند موجود تھے جن کا عقیدہ تھا کہ:۔

حضرت چمن شاہ صاحب کی برکت سے یاسمین کو ترقی ہوئی اور حضرت قبلہ مرتے مرتے اس کو فیض پہنچا گئے۔

آگ

——— کبھی کے دن بڑے، کبھی کی راتیں بڑی ...... یہی ہوتا ہے اس دنیا میں گردھاری ——— کشور کھانستے ہوئے بولا۔

——— کس کی شکایت کر رہے ہو .... کشور! دنیا کی یا دنیا والوں کی ——— گردھاری نے جواب میں کہا۔

——— کسی کی نہیں بھیا! اپنی قسمت ہی سے شکایت ہے، قسمت بُری نہ ہوتی تو در در کی ٹھوکریں کاہے کو کھانی پڑتیں، چلتی کا نام گاڑی ہے، دھن دولت کی پوجا ہوتی ہے اس دُنیا میں! غریبوں کو کوئی نہیں پُوچھتا ——— کشور نے جواب دیا۔

——— بتاؤ تو سہی، آخر ہوا کیا؟ میں نے تو تمھیں آج کے برابر کبھی غمگین اور پریشان نہیں دیکھا ——— گردھاری نے کہا۔

——— کلکٹری کچہری میں ایک جگہ خالی ہوئی ہے میں رائے بہادر رگھوناتھ سنگھ کے پاس گیا تھا کہ کلکٹر صاحب سے میری سفارش کر دیجیے، وہ میرے اتنا کہنے پر بگڑ ہی تو گئے، پیشانی پر شکنیں ڈالتے ہوئے بولے، تم اپنی اوقات کو دیکھو اور کلکٹر صاحب کو دیکھو! ہر شخص ملکی لاٹ بننا چاہتا ہے .... ! نوکری کرنی ہے تو میونسپلٹی میں جاکر عرضی دو

وہاں پندرہ بیس روپیہ کی کسی کیری مل جائے گی۔ فلکٹری کے دفتر میں تو ہم جیسے جھانک بھی نہیں سکتے ——— کشور متاثر ہوتے ہوئے بولا۔

——— رائے بہادر صاحب سے تمہارے پتاجی کی تو بڑی دوستی تھی گردھاری نے دیوار سے پیٹھ لگاتے ہوئے جواب دیا۔

——— اسی کا تو غم ہے کشور! پتاجی کے پاس یہ رائے بہادر صاحب دن میں چار چار مرتبہ آتے تھے میری بڑی بہن کے بیاہ میں اسی رگھوناتھ نے مہمانوں کے سامنے پتریں رکھی تھیں، پتاجی کے مرتے ہی وہ بالکل بدل گیا جیسے اس سے اور میرے باپ سے جان پہچان ہی نہ تھی، بے مروتی اور احسان فراموشی کی کوئی حد ہونی چاہیئے۔

کشور نے کہا

——— کشور! دنیا میں یہی ہو رہا ہے، دنیا کے لوگ بڑے مطلبی اور غرض کے بندے ہیں، کسی سے کوئی کام ہو تو اس کے چرنوں میں سیس نوا دیں اور کوئی غرض نہ ہو تو اسکو آتا دیکھ کر کتراتے ہوئے نکل جائیں ——— ! گردھاری سگرٹ کی گل جھٹکتے ہوئے بولا اور دونوں بہت دیر تک ملازمت کے مسئلے پر گفتگو کرتے رہے۔

کشور کی عمر بیس سال کے لگ بھگ تھی، اس کے باپ ایک بہت بڑی فیکٹری کے منیجنگ ڈائرکٹر تھے، کشور آٹھویں جماعت میں تھا کہ اس کے باپ کا فالج سے انتقال ہو گیا، کشور کے باپ کی تنخواہ ہزار روپیہ ماہوار تھی مگر بلا کے خرچ کرنیوالے تھے! دوستوں کی دعوت، سیر و تفریح، پارٹی بازی، کلب کے چندے، غرض ان کے مصارف کے بہت سے شعبے تھے، مرنے سے کچھ دن پہلے تو وہ شراب بھی پینے لگے تھے، ایسے شاہ خرچ آدمی کے پاس روپیہ بچ ہی نہیں سکتا۔ تھوڑی بہت پونجی تھی

سو دان کی بیماری میں لگ گئی، کشور کی ماں کے پاس تھوڑا بہت پس انداز تھا اس سے تین سال تک گھر چلتا رہا اور کشور نے میٹرک کے امتحان میں کامیابی حاصل کر لی۔

شہر کے بڑے بڑے آدمی کشور کے باپ کے دوست تھے، مگر ان کے مرتے ہی دوستی ختم ہو گئی۔ مرنے والے دوست کے بیٹے کو کسی نے بھی نہ پوچھا۔ کشور نے ملازمت کے لئے کوشش کی حد کر دی، جس دفتر میں سنتا کہ جگہ خالی ہے درخواست دیتا کوششیں کرتا، تھوڑی بہت سفارشیں پہنچاتا مگر کامیابی نہ ہونی تھی نہ ہوئی۔ بے سہارے امیدوار کو ٹالنے کے لئے سو عذر تراش دئے جاتے ہیں، بیسویں صدی کا انصاف اور قانون دنیوی عزت اور دولت کے سامنے جھکتا ہے غریبوں کے لئے اس میں نہ کوئی لچک ہے نہ استثنار۔!

پیہم ناکامیوں اور مسلسل شکستوں نے کشور کا دل توڑ دیا تھا، وہ ہر دم کھویا کھویا سا رہتا، گھر میں ایک نہیں چار آدمی کھانے والے تھے، کشور اس کی غمزدہ ماں، اور دو بہنیں، ایک بہن جوان تھی اور دوسری کی عمر بہت سے بہت نو سال کی ہو گی گھر کی چیزیں بک بک کر گزر ہو رہی تھی۔ کشور نوجوان تھا اور جوانی زمانہ نوجوانی میں بہت سی بری راہیں پیدا کر لیتی ہے مگر کشور میں زمانہ کے نشیب و فراز کی نہ جانے کہاں سے سمجھ آگئی تھی، اپنے گھر والوں کی پریشاں حالی کا اسے احساس تھا اور یہ چیز بھی وہ اچھی طرح محسوس کرتا تھا کہ جس گھر میں ایک ایک ہزار روپیہ ایک ایک مہینہ میں خرچ ہو چکا ہے اس میں دو وقت کے کھانے کے لئے بھی مشکل پڑتی ہے، کثر ایسا ہوا کہ کشور نے کھانے کی کمی دیکھ کر ایک آدھ روٹی کھائی اور ہاتھ دھو کر کھڑا ہو گیا، ماں نے پوچھا تو کہہ دیا کہ مجھے قبض ہے، زیادہ کھانا نقصان کرے گا۔

ریلوے کے محکمہ میں امیدواروں کی ضرورت ہوئی، کشور تو ہر دفتر کی خیر خبر رکھتا تھا اُس نے خبر پاتے ہی درخواست دے دی، اتفاق کی بات کہ ان نئی جگھوں کے لیے بہت ہی کم امیدواروں کی درخواستیں وصول ہوئیں۔ مقابلہ کے امتحان میں کشور کامیاب ہو گیا اور اس کا نام انتخاب کی فہرست میں آ گیا۔ انتخاب کے بعد ڈاکٹری سارٹیفکیٹ کی ضرورت پڑی، کشور کی ماں نے اپنی چھوٹی بچی کے ہاتھ کے کڑے بیچ کر ڈاکٹر کی فیس کے روپے دئے۔ کشور نوکر ہو گیا، تنخواہ چالیس روپیہ ماہوار تھی امیدوارو سے وعدہ کیا گیا تھا کہ دو سال کے بعد بہت کافی ترقی ہو جائے گی۔ چالیس روپیہ میں کشور کے گھر والوں کا پورا نہیں پڑتا تھا مگر وہ جو کسی نے کہا ہو کہ روزگار تو نمک کی کنکری کا بھی اطمینان بخش ہوتا ہو اس ملازمت سے بے روزگاری بہر حال دور ہو گئی۔

کشور تین مہینے تک ریلوے میں کام کرتا رہا۔ ایک دن وہ آفس سپرنٹنڈنٹ کے پاس دستخط لینے کے لئے گیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے کاغذ تو میز پر رکھ لئے اور کشور سے دل دہی کی باتیں کرتے ہوئے بولا:-

مسٹر کشور! ہم کو افسوس ہو کہ تمام نئی جگھیں کمی میں آگئیں، تم نئے ملازموں کو مہینہ ختم ہونے پر ہٹ جانا پڑے گا۔

کشور اچانک یہ خبر سُن کر ششدر رہ گیا، جیسے اس کی رُوح کو کسی نے دبوچ لیا، شام تک ریلوے کی طرف سے اسے اور دوسرے نئے ملازموں کو باقاعدہ نوٹس مل گیا کہ تم لوگ علیحدہ کئے جاتے ہو لیکن ریلوے ڈیپارٹمنٹ نے اپنے امیدواروں کی فہرست میں تمہارے نام لکھ لئے ہیں، جیسے جیسے جگھیں خالی ہوتی جائیں گی تم لوگوں کو

ان پر مامور کیا جائے گا۔

کشور کے لئے یہ نوٹس موت کا پروانہ تھا، بڑی دوڑ دھوپ کے بعد تو یہ ملازمت ملی تھی سو وہ تین مہینے کے اندر جاتی رہی، اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، گھر کو جاتے ہوئے اس کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ گھر والے اس خبر کو سنکر پریشان ہو جائیں گے، مگر اس خبر کو وہ چھپا بھی نہ سکتا تھا، وہ سہمے ہوئے انداز میں گھر آیا، ماں نے پُوچھا کشور! آج تمہارا چہرہ بے رونق سا ہو رہا ہے، شاید دن بھر کام کیا ہے تم نے —! اس پر کشور کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔

—— کیا بات ہے کشور! کیا دفتر میں کوئی غلطی ہو گئی تم سے —————— کشور کی ماں نے دریافت کیا۔

—— نہیں ماں! مجھ سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، مجھے دفتر میں اب غلطی کرنیکا موقع ہی نہیں دیا جائے گا —————— کشور نے جواب دیا۔

—— دفتر میں غلطی کرنے کا موقع نہیں دیا جائے گا —————— اس سے تمہارا مطلب کیا ہے —————— ؟ ماں نے کہا۔

—— ہم سب نئے ملازموں کو علیحدہ کر دیا گیا —————— کشور جیب سے نوٹس نکالتے ہوئے بولا۔

علیحدگی کا حال سنکر کشور کی ماں کو دھکا سا لگا، اس کے چہرے پر زردی سی دوڑ گئی مگر عورت تھی ہمت والی، دل کڑا کر کے بولی :۔

—— تو تم اتنے اُداس کیوں ہوتے ہو، ایشور کوئی اور بندوبست کرے گا —————— جوان آدمی کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔

——— ایشور (طنز آمیز ہنسی کے ساتھ) اب پہلا سا ایشور نہیں رہا اس نے غریبوں کی طرف سے شاید آنکھیں بند کرلی ہیں، وہ دھن دولت والوں کا خدا ہی۔ اس کے دربا میں قہقہوں کی گونج چاہیئے، آہوں اور آنسوؤں کے لئے اس کے یہاں کوئی جگہ نہیں ہی ——— کشور نے کوٹ اُتارتے ہوئے جواب دیا۔

——— بیٹا! ایسی باتیں نہ کرو، ایشور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں کرتا۔ اس کے یہاں دیر ہی اندھیر نہیں! عیش و آرام کے دن بھی تو تم ہی نے گذارے ہیں، چند دن بپتا کے بھی سہی۔! ایشور ہم لوگوں کی پرکھشا (امتحان) لے رہا ہی ہمیں اس میں پورا اُترنا چاہیئے، دُکھ کو بُرا نہ سمجھو اس آگ میں پڑ کر آدمی سونا بن جاتا ہی اور ——— کشور کی ماں کی بات کاٹتے ہوئے، کشور کی چھوٹی بہن مسکرا کر بول اٹھی ———

——— ارے بھیّا! رات میں نے سوتے وقت ایشور سے پرارتھنا کی کہ صبح کو تازہ جلیبیاں کھانے کو ملیں، صبح اُٹھتے ہی ماتاجی نے میرے بنا کہے حلوائی کے یہاں سے جلیبیاں منگوادیں ——— ! ایشور ہی تو سب کچھ ہے اس کے حکم کے بنا کچھ نہیں ہوسکتا، تم دھیرج رکھو میں ایشور سے رو رو کر پرارتھنا کروں گی کہ میرے بھیّا کو نوکری ملجائے اور تم کہو تو ایشور سے کہہ کر اس حاکم کو میں دفتر سے نکلوادوں جس نے تمھاری لگی لگائی نوکری چھڑادی ——— کشور کی بہن کی باتوں پر سب ہنسنے لگے کشور بہن کے رخسار پر پیار کا ہلکا سا طمانچہ مارتے ہوئے بولا:۔

——— اری پگلی! ایشور تیرے ایسے ہی کہنے میں ہیں تو مجھے ان سے کہہ کر کسی ریاست کا راجہ کرادے، اور ہاں! پہلے تو اپنے ایشور سے کہہ یہ ہمارا گھر سونے کا ہوجائے ایشور کی شکتی تو سُنا ہی کنکر کو ہیرا بنا سکتی ہے۔

کشور کی چھوٹی بہن نے اس پر کہا:۔

ہاں ! ہاں ! میرا ایشور ایسا ہی شکتی مان ہے اس کے حکم سے مٹی سونا بن سکتی ہے پر بھیا ! میری پوری کچوریاں سونے کی ہوگئیں تو کیسے کھاؤں گی اور ہمارا گھر سونیکا ہوگیا تو شہر والے ہمیں چین سے بیٹھنے دیں گے۔

تھوڑی دیر تک بھائی بہن میں مزے مزے کی باتیں ہوتی رہیں۔

کشور کے لئے پھر وہی مصائب موجود تھے جن سے وہ نبرد آزما ہو چکا تھا۔ اس نے ملازمت کے لئے اِدھر ادھر سلسلہ جنبانی کی مگر کامیابی نہیں ہوئی کشور کے مکان کے قریب ہی ایک بنگلہ تھا جس میں انکم ٹیکس افسر کرایہ پر آ کر رہا، انکم ٹیکس افسر جسے سب گپتا جی کہہ کر پکارتے تھے نہایت ہی فیشن ایبل شخص تھا۔ ہر وقت کوٹ پتلون میں کسا بندھا رہتا، اور سگرٹ تو اس کے ہونٹوں سے کبھی الگ ہی نہ ہوتی تھی، جب دیکھو دھوئیں اڑا رہا ہے۔

کشور کی جوان بہن کو اُس نے دو چار مرتبہ دیکھ لیا تھا۔ اُسے محلہ والوں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ کشور بے روزگار ہے اور اس کے گھر والوں کی بڑی تنگی ترشی سے گذر ہوتی ہے۔ یا تو وہ کشور کی طرف دیکھتا بھی نہ تھا اور اب اس نے کشور سے راہ و رسم بڑھانے کی از خود کوشش کی۔ کشور اس کے یہاں آنے جانے لگا۔ گپتا جی نے ایک دن کشور سے کہا کہ نہر کے محکمہ کے انجینیر میرے بہت گہرے دوست ہیں میں نے اُن سے زبانی بھی تمہارا ذکر کر دیا ہے اب یہ چھٹی دیتا ہوں اُن سے جا کر ملو وہ تم کو پچاس ساٹھ روپے کی ملازمت تو اسی وقت دیدیں گے پھر نہر کے محکمہ میں تنخواہ سے زیادہ اوپر سے ملجاتا ہے کشور نے سفارشی خط لیکر گپتا جی کا شکریہ ادا کیا۔

—— مسٹر کشور! انجنیئر صاحب سے ملنے کے بعد پھر مجھ سے ضرور ملنا ——

کشور کو جاتا دیکھ کر گپتا جی نے کہا۔

—— بہت اچھا میں اُن سے مل کر سیدھا آپ ہی کے پاس آؤں گا ——

کشور نے جواب دیا۔

—— اور ہاں! کشور تم کتنے بہن بھائی ہو —— گپتا جی نے دریافت کیا۔

—— ایک میں ہوں اور دو بہنیں ہیں —— کشور جیب میں

خط رکھتے ہوئے بولا۔

—— تو بھئی! کسی دن تم اور تمہاری بہنیں سینما ہمارے ساتھ کیوں نہ چلیں۔

گپتا جی نے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

—— میری بہنیں سینما نہیں دیکھتیں —— کشور گپتا جی کو تیز اور مشتبہ

نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

—— تو پھر ان کو ہمارے یہاں چائے پر کسی دن لے آؤ ——

ادھر گپتا جی نے جواب دیا اور ادھر کشور نے سفارشی خط کے پُرزے اڑا دیئے۔ اُس کی

آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے وہ گپتا جی کی طرف بڑھتے ہوئے کہنے لگا:۔

—— گپتا جی! آپ نے غریبوں کو اتنا بے غیرت اور بیوقوف کیوں سمجھ رکھا ہے؟

آپ کی ہمدردی کے پیچھے کیا چیز ہے؟ اُسے میں سمجھ گیا۔! بہن بیٹی تو آپ کے بھی

ہوں گی اگر آپ کی بہن یا بیٹی کے بارے میں انہی خیالات کا میری طرف سے

اظہار کیا جائے تو کیا آپ اُسے برداشت کر سکیں گے، میں آپ سے کہتا ہوں کہ

بس اس حد سے آگے نہ بڑھیئے نہیں تو اچھا نہ ہوگا۔ جان عزت آبرو کا صدقہ ہوتی

ہے۔ سمجھے انکم ٹیکس افسر صاحب بہادر! یہ آپ کا ٹوپ زمین پر ناچتا نظر آئے گا۔!

انکم ٹیکس افسر نے جواب میں ایک لفظ بھی نہ کہا اس کے دل میں چور تھا جسے کشور پکڑ چکا تھا وہ جھینپ کر بنگلہ میں چلا گیا سفارشی خط کے پُرزے بنگلہ کے صحن میں اُڑ رہے تھے!

کشور نے ملازمت کے لئے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی مگر کامیابی نہ ہوئی وہ تو خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ کشور کے باپ نے ایک کمپنی میں کچھ حصے لئے تھے اُس کے کاغذات مل گئے اور کشور نے ضرورت کے سبب بہت ہی سستے داموں پر کمپنی کے حصے فروخت کر دئے اس طرح کچھ رقم مل گئی اور کشور کے گھر والے فاقوں کی مصیبت سے بچ گئے۔ کشور کی ماں بہت کفایت شعار اور سلیقہ مند عورت تھی مگر کفایت شعاری روپیہ پیسہ کی آمدنی ہو تو اپنا جوہر دکھاتی ہے جس گھر میں ایک پیسہ کی آمدنی نہ ہو اور چار کھانے والے موجود ہوں وہاں کفایت شعاری کا خود دم گھٹنے لگتا ہے۔ کمپنی کے حصوں کا آیا ہوا روپیہ بھی کب تک ساتھ دیتا، چھ سات مہینے کے بعد معلوم ہوا کہ اب ایک دو مہینے سے زیادہ گذر نہیں ہو سکتی اور نہایت ہی المناک مصائب کشور کے گھر والوں کا انتظار کر رہے ہیں۔

کشور نے اخبار میں ایک اشتہار پڑھا جس میں لکھا تھا کہ سگرٹ کمپنی کے لئے نوجوان اور تعلیم یافتہ کمنویسروں کی ضرورت ہے، کشور نے درخواست بھیجی، کمپنی کی طرف سے جواب آیا کہ فلاں تاریخ کو مینجر صاحب سے آکر ملاقات کرو، کشور مینجر صاحب سے جا کر ملا، مینجر نے کشور سے چند سوالات کئے، کشور نے ان کا نہایت ہی معقول اور اطمینان بخش جواب دیا، کشور کا تقرر کر دیا گیا، تنخواہ ساٹھ روپیہ ماہوار قرار پائی اور ریل کا

کرایہ اور سفر کا بھتہ اس کے علاوہ ۔!

کشور نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا، اس کا کام تمام کنویسروں سے اچھا تھا، کمپنی کی طرف سے اُس کی خدمات کی خاطر خواہ قدردانی کی گئی اور ایک ہی سال میں اُسے انسپکٹر بنا دیا گیا۔ کشور کی تنخواہ اب ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تھی، ریل کے سفر میں ڈبل انٹر کا کرایہ ملتا، ایک چپراسی اور ایک کنویسر اس کے ساتھ رہتا، کشور اب افسر ہو گیا تھا جس کی سفارش پر چپراسیوں اور کنویسروں کو نوکری ملتی تھی کشور کے طرزِ عمل سے سب لوگ خوش تھے، انسپکٹر بن کر اس میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی، وہ پہلے کی طرح منکسر المزاج اور خلیق تھا۔ سفر میں چپراسیوں کے آرام کا خیال رکھتا، اس کی بات چیت کا انداز بہت ہی نرم اور خوش کن تھا وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ آدمی سے بھول چوک ہو ہی جاتی ہے، اس لئے اپنے زیر دستوں کی غلطیوں کو وہ کہہ سنکر معاف کر دیتا۔ افسر بنکر اس کا دماغ خراب نہیں ہوا۔ ترقی پاکر تو اُس میں اور زیادہ انسانیت آگئی تھی، اس زمانہ میں لوگ افسر بن کر سرکش اور مغرور ہو جاتے ہیں لیکن کشور میں فروتنی، خلق، عفو و درگذر اور بلند نظری پیدا ہو گئی تھی، اپنی پریشانی کے دن اُسے ایک ایک کر کے یاد تھے وہ جانتا تھا کہ غریبوں کا دل کتنا نازک اور شکستہ ہوتا ہے۔

کشور مہینہ میں بیس دن شہروں کا دورہ کرتا اور دس دن ہیڈ آفس میں کام انجام دیتا۔ گرمی کا زمانہ تھا اور وہ دورہ پر گیا ہوا تھا۔ کئی قصبوں اور شہروں میں دورہ کرتا ہوا وہ الہ آباد آیا اور وہاں کے ڈاک بنگلہ میں ٹھیر گیا۔ کشور کے پروگرام کے مطابق اُسے الہ آباد میں دو دن رہنا چاہیئے تھا مگر یکایک کمپنی کی طرف سے ضروری تار آگیا کہ الہ آباد میں سگرٹ کمپنی کی ایک شاخ قائم کرنے کی ضرورت ہے وہاں کے حالات کا اندازہ

کر کے مفصل رپورٹ لکھ کر بھیجو۔ کشور چند دن کے لئے اور ٹھیر گیا۔ وہ دن بھر شہر میں گھومتا اور پان سگرٹ کی دوکانوں پر معلوم کرتا کہ کس قسم کے سگرٹ کی زیادہ مانگ ہے آلہ باد کے لوگ کونسی سگرٹ زیادہ پسند کرتے ہیں، سگرٹ کے مقابلہ میں بیڑی کی فروخت زیادہ کیوں ہے؟ حقّہ کس طبقہ میں زیادہ پیا جاتا ہے، شہر کے کس محلہ اور حلقہ میں سگرٹ کا رواج زیادہ ہے، اب تک اس شہر میں کون کونسی سگرٹیں مقبول ہو کر نامقبول ہو چکی ہیں اور اس کے اسباب کیا ہیں؟ کمپنی کی طرف سے تو دو چار ہی ہدایتیں لکھکر آئی تھیں، مگر کشور نے اپنی ذہانت سے وہ سب کچھ معلوم کر لیا جس کی کمپنی کو ضرورت تھی، کمپنی والوں کو تو ان جزئی تفصیلات کا تصوّر تک نہ تھا۔

کشور ایک دن بازار سے ڈاک بنگلہ کو واپس آرہا تھا کہ راستہ میں ایک مکان سے شور اُٹھا کہ "آگ لگ گئی" کشور تانگہ سے اُتر کر مکان کی طرف دوڑا، آگ زور پکڑ چکی تھی مکان کی چھتوں سے شعلے نکل رہے تھے، آگ بجھانے والا انجن اب تک آیا نہ تھا۔ مکان کے چند آدمی نکلکر باہر آگئے تھے اور ان میں سے ایک بوڑھا بدحواس ہو کر کہہ رہا تھا...... "ارے میری! بیٹی شانتی تو مکان ہی میں رہ گئی.... ہائے رام"!

جلتی ہوئی آگ اور دہکتے ہوئے شعلوں میں جانے کے لئے کوئی تماشائی تیار نہ تھا، تدبیریں سب بتا رہے تھے کہ یہ کرو، اس طرح جاؤ، مکان کے اس حصّہ میں آگ نہیں پہنچی، اس راستہ سے جایا جا سکتا ہے مگر یہ سب زبانی باتیں تھیں، نہ تو آگ کے شعلے زبانی باتوں سے بجھ سکتے ہیں اور نہ ان منطقوں سے جلتے ہوئے مکان کا کوئی آدمی بچایا جا سکتا ہے۔

مکان کے مشرقی حصے میں آگ زیادہ نہ تھی۔ کشور اُس طرف پہنچا اور اندر گھس گیا

مکان کا اندرونی حصہ دھرد ھر جل رہا تھا اُس نے دیکھا کہ بڑے کمرے کی میز کے قریب ایک نوجوان لڑکی بے ہوش پڑی ہوئی ہے اور شعلے اس کے بدن کے قریب پہنچا ہی چاہتے ہیں، کشور ہمت کر کے اندر بڑھا لڑکی کو اُٹھا کر باہر لایا مگر آگ دونوں کے کپڑوں میں لگ چکی تھی، باہر کے لوگوں نے پانی ڈال کر آگ کو بجھا دیا، کشور اور لڑکی دونوں بے ہوش تھے دونوں کو ہسپتال پہونچایا گیا۔

کشور ہسپتال کے مردانہ حصہ میں تھا اور لڑکی زنانہ وارڈ میں! دونوں کے چہرے آگ سے جُھلس گئے تھے، مرہم پٹی ہوتی چند دن میں آرام تو ہو گیا مگر چہرے پر داغ رہ گئے، چہرے کے داغ تو یوں بھی بدنما ہوتے ہیں اور یہ تو جلے ہوئے داغ تھے جن کو بہر حال بدنما ہونا ہی چاہیئے تھا۔ شہر میں کشور کی انسانی ہمدردی اور جرأتِ بے باک کی تعریفیں ہونے لگیں۔ شہر میں کشور کی ایک طرف تو تعریفیں ہو رہی تھیں اور دوسری طرف بعض کمینہ فطرت لوگ اس خبر کو پھیلا رہے تھے کہ اس نوجوان نے اس قدر خطرے میں پڑ کر جو اس لڑکی کو نکالا تو اس میں ضرور کوئی بھید ہے، دونوں کی پہلے سے جان پہچان ہوگی ورنہ کسی انجان اور غیر کے لئے کون اپنی جان خطرے میں ڈالتا ہے لڑکی کے گھر والوں کے کان تک بھی یہ خبر پہنچی اور ان کو بےحد صدمہ ہوا، لڑکی کے چچا نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ شانتی جلکر مر جاتی تو اچھا تھا لوگوں کے شرمناک طعنے تو نہ سننا پڑتے ___!

شانتی کے گھر والوں کو کشور سے ہمدردی تھی اور وہ اس کی خبر گیری کر رہے تھے لیکن جب انھوں نے یہ سُنا کہ شہر کے لوگ اس واقعہ کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی کنواری لڑکی کی بدنامی ہو رہی ہے تو ان کی ہمدردی کا موّاج دریا یکایک

پایاب ہوگیا اور وہ کشور کی طرف سے بے توجہ ہوگئے ہسپتال میں کشور کا علاج ہوتا رہا اس نے اپنے گھر کے لوگوں کو اس واقعہ کی اطلاع نہیں دی کہ وہ پریشان ہو کر الہ آباد چلے آئیں گے۔

کمپنی کی طرف سے دو آدمی الہ آباد آ گئے تھے جنھوں نے کشور کا کام اپنے چارج میں لے لیا اور ہسپتال کے ذمہ دار عہدیداروں سے ملکر کشور کے علاج پر خاص توجہ دینے کی سفارش کی۔ کشور نے ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے یہی دریافت کیا کہ جس لڑکی کو میں نے آگ سے نکالا تھا وہ کس حال میں ہے، نرسوں نے جواب دیا کہ اس کی حالت اچھی ہے، شانتی سے اس کے گھر والوں نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا کہ کشور نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اسے بچایا مگر دوسرے لوگوں کی زبانی اسے معلوم ہوگیا ایک پردیسی نوجوان راہگیر نے اس کی جان بچائی۔ اپنے گھر والوں سے شانتی دریافت کرتی کہ آگ کیسے لگی، کس طرح بجھائی گئی اسے کس نے بچایا تو وہ اور تو سب کچھ بتلاتے مگر کشور کی ہمدردی کے ذکر کو صاف اڑا جاتے۔ کشور کے ذکر سے ان کو تکلیف ہوتی تھی ہسپتال میں کشور کی موجودگی سے شانتی کو بے خبر رکھا گیا شانتی کو آرام تو ہوگیا مگر زخم پورے طور پر مندمل نہیں ہوئے لیکن ڈاکٹروں نے کہا کہ خطرے اور تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ مکان پر رہ کر بھی علاج ہو سکتا ہے۔ شانتی ہسپتال سے شہر کے مکان میں منتقل کر دی گئی ۔ !

کشور بھی اچھا ہو کر اپنے گھر چلا گیا اس کے چہرے پر داغ باقی رہ گئے تھے، اس کی ماں نے پہلی نظر میں تو کشور کو پہچانا نہیں، چہرے کے داغ دیکھ کر وہ پریشان ہوگئی، کشور نے ساری داستان سنائی، کشور کی ہمدردی اور جرأت کی تو اس کی ماں نے

تعریف کی مگر چہرے کے بدنما داغوں نے اُس کے دل پر داغ ڈال دیئے۔ اچھا خاصہ چہرہ بدنما ہوگیا، جلے ہوئے داغ برص کے داغ معلوم ہوتے تھے۔ کشور کو بھی آئینہ میں چہرہ دیکھتے وقت اس کا احساس ہوتا، مگر اس احساس کے ساتھ ہی مسرت کا جذبہ چہرے پر سُرخی پیدا کر دیتا کہ بلا سے چہرہ داغدار ہوگیا مگر ایک انسان کی جان تو بچ گئی، انسانی زندگی چہرے کی خوبصورتی سے بہرحال زیادہ گرانقدر اور قابلِ احترام ہے۔!

جوانی میں تو کالے کلوٹے بھی اچھے معلوم ہوتے ہیں اور شانتی تو واقعی خوبصورت تھی، جوانی نے اس شراب کو اور تیز کر دیا مگر چہرے کے داغوں نے اُس کے حُسن کی دنیا ہی بدل ڈالی، وہ پہلے حسین اور جاذبِ نظر تھی اور اب بدصورت ہوگئی، آتش زنی کا حادثہ اس کی زندگی کا سب سے زیادہ الم انگیز واقعہ تھا حسین آدمی کا بدصورت ہو جانا حادثہ نہیں تو اور کیا ہے۔ اس سے زیادہ قیامت انگیز حادثہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ شانتی نے آئینہ دیکھنا چھوڑ دیا تھا کہ چہرے کو دیکھکر اُسے روحانی کوفت ہوتی تھی۔ چہرے کے داغ دل کی خراش بن چکے تھے، پھر اس پر قیامت یہ کہ کئی جگہ شانتی کے بیاہ کی بات چلی مگر لڑکے والوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ لڑکی کے چہرے پر بدنما داغ ہیں تو انھوں نے صاف انکار کر دیا جوان بیٹی گھر والوں کو پہاڑ معلوم ہوتی ہے۔ شانتا کے ماں باپ محسوس کر رہے تھے کہ یہ پہاڑ ان کے گھر سے مشکل ہی سے ٹلے گا۔

بڑی کوشش اور جدوجہد کے بعد ایک جگہ شانتی کے بیاہ کی بات پکی ہوئی شانتی کے باپ نے کئی ہزار روپیہ نقد دینے کا وعدہ کیا، تاریخ مقرر ہوئی، بارات آئی بیٹی والوں نے بارات کی بڑی خاطر و مدارات کی، مذہبی رسمیں ادا ہوتے وقت دولھا نے شانتی کو دیکھا۔ شانتی کے چہرے کے داغوں کو دیکھکر اس نے ایک جھٹکا مارا،

دولہن کے دوپٹہ سے اس کا بندھا ہوا دامن جُدا ہو گیا اور بولا کہ میں اس لڑکی سے بیاہ نہیں کروں گا۔ اس کے گھر والوں نے بہت کچھ سمجھایا بجھایا مگر اُس نے نہایت سختی سے انکار کر دیا، بارات واپس چلی گئی، شانتی کے ہاتھوں میں بیاہ کی مہندی لگی کی لگی رہ گئی اس کا سہاگ اُجڑ گیا ابھی وہ دُلہن تھی اور ابھی وہ بیوہ ہو گئی ——— بیوہ ———! نئی قسم کی بیوہ ——— جس کا شوہر موجود ہو مگر وہ اس کی بیوی نہ بن سکے ———! شانتی کے گھر میں یا تو خوشیاں ہو رہی تھیں اور اب کہرام بپا ہو گیا، مسکراہٹیں غمناک سکوت سے بدل گئیں، سب ایک دوسرے کا منہ تکتے تھے، موت کے گھر میں بھی ایسی افسردگی کا ہے کو ہو گی، مرنے والے پر تو لوگ آنسو بہا کر کلیجہ ٹھنڈا کر لیتے ہیں اور یہاں تو شدتِ غم سے آنسو بھی نہ نکلتے تھے۔ موت کا آنا برحق ہے اس لئے کسی کے مرنے پر رنج تو ہوتا ہی حیرت نہیں ہوتی مگر یہ واقعہ تو الم انگیز ہی نہیں انتہائی حیرت انگیز بھی تھا کسی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ عین شادی کے وقت دولھا دُلہن کو ٹھکرا دے گا، پھولوں کے گجرے اب بھی شانتی کے گھر میں لٹک رہے تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی قبر پر چڑھائے ہوئے پھول ہیں، جلتی ہوئی بھٹیوں اور دہکتے ہوئے چولھوں میں پانی چھڑوا دیا گیا، پکوان بند، ڈھول تاشے موقوف، کہاروں نے بہنگیاں کاندھوں سے اتار کر رکھ دیں ———!

شانتی کا تو غم سے یہ حال تھا جیسے اس میں جان ہی نہیں رہی مورت کی مٹی کی طرح وہ کونے میں بیٹھی ہوئی تھی، چہرے کے بدنما داغ شباب کی امنگوں کو تو نہیں روک سکتے بیاہ کی خوشی نے اس کے چہرے پر بشاشت کی لہر دوڑا دی تھی مگر اب اس کا چہرہ ذرا سی دیر میں دق کے مریض کے چہرے کی طرح پیلا پڑ گیا، شانتی کو یہ احساس مارے

ڈالتا تھا کہ یہ سب کچھ اسی کی وجہ سے ہوا اگر آج کو اس کا چہرہ بدنما نہ ہوتا تو دوسری کنواری لڑکیوں کی طرح وہ بھی دُلہن بن کر سسرال جاتی۔

شانتی کے گھر والے انتہائی ذلت اور بے غیرتی محسوس کر رہے تھے۔ بیٹی والے کے گھر پر بارات کا آکر واپس چلا جانا دولھا کا بیاہ کرنے سے انکار کر دینا بے عزتی اور ذلت نہیں تو اور کیا ہی۔ سب لوگ شانتی کی تسکین کے لئے دل دہی کی باتیں تو کر رہے تھے لیکن ان باتوں میں طنز آمیز محبت بھی شامل تھی۔ شانتی نے اپنے کانوں سے باپ کی زبان سے یہ الفاظ سُنے:۔

"کاش! یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مرجاتا"

شانتی کا کلیجہ غم کی شدت سے پھٹا جاتا تھا وہ خود کو اس مُجرم کی طرح سمجھتی تھی جس کا کوئی قصور تو نہ ہو مگر عدالت سے اُس کو سزا کا حکم دے دیا جائے۔

اُس نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کر لیا —— خطرناک فیصلہ ——! وہ اس واقعہ کے ایک ماہ کے بعد گھر سے فرار ہو گئی، الہ آباد میں اس کے ارادے کی تکمیل کے بہت سے ذرائع تھے مگر ارادہ چونکہ بہت زیادہ خطرناک تھا اس کے احساس نے اسے بدحواس بنا دیا، وطن سے وہ ریل گاڑی میں سوار ہو کر ایک چھوٹے سے جنکشن پر اُتر گئی، شانتی بہت بدحواس اور پریشان خاطر تھی اُس کی چال ڈھال سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی خطرناک اقدام کا عزم رکھتی ہی۔ اسی بدحواسی کے عالم میں وہ زنانہ ویٹنگ روم کی بجائے مردانہ ویٹنگ روم میں چلی گئی۔

—— یہ تو مردوں کا ویٹنگ رُوم ہی، زنانہ ویٹنگ رُوم تو اُدھر بک اسٹال کے پاس ہے —— ویٹنگ رُوم کے ملازم نے کہا۔

یہ تم نے کیا زنانے مردانے کا فرق لگا رکھا ہے ...... خاموش رہو ......

شانتی جواب دیتے ہوئے اندر چلی گئی، ویٹنگ روم میں کوئی آدمی نہیں تھا میز پر ادھ جلی سگرٹ رکھی ہوئی تھی، آرام کرسی کے نیچے ترکاری کا دونا پڑا تھا اور شیشہ لگی ہوئی میز پر ڈاڑھی بنانے کی استعمال کی ہوئی پتی رکھی تھی۔!

شانتی ویٹنگ روم میں ٹہلنے لگی، دیواروں پر بہت سے اشتہار لٹک رہے تھے، ایک اشتہار پر جس کی سرخی تھی ——— خبردار ———!

جان کا خطرہ ———!

شانتی کی نظر پڑ گئی، وہ اشتہار کو پھاڑ کر پھینکتے ہوئے بولی:۔

یہ دنیا انسانوں کے رہنے کے قابل کب ہو جو جان کے خطرے سے ڈرایا جاتا ہے ——— اس کے بعد اُس نے آئینہ میں چہرے کو دیکھا اور خشمناک مگر طنز آمیز قہقہہ لگا کر بولی:۔

میرے چہرے کے بدنما داغو! میں اب تمھاری توہین برداشت نہیں کر سکتی تمھاری آسودگی کا میں نے انتظام کر لیا ہو ———!

شانتی تھوڑی دیر انگلیاں چٹخاتی ہوئی ویٹنگ روم میں تیز تیز ٹہلتی رہی اُسکے چہرے پر وحشت کے آثار پائے جاتے تھے چہرے کے داغوں نے اس وحشت کو اور زیادہ خشک اور ڈراؤنا بنا دیا تھا، ٹہلتے ٹہلتے وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ایک کاغذ پر لکھنا شروع کیا، لکھنے میں کئی دفعہ اُس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان کو پھیرا، شدتِ جذبات سے وہ کانپ رہی تھی، ہونٹ سوکھے ہوئے تھے، چہرہ سُت گیا تھا آنکھوں میں وحشت جھلکتی تھی اور بدن پسینہ میں شرابور تھا خط لکھکر وہ بیہوش ہو گئی۔!

کشور اپنے دورے پر تھا، اُسی جنکشن سے اُسے دوسرے مقام کے لیے گاڑی تبدیل کرنی تھی، اُس کا سامان چپراسی موٹر کے ذریعہ لے گئے تھے وہ تنہا تھا اُس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی اور ایک ہلکا ہینڈ بیگ تھا، اُس نے بک اسٹال سے اخبار خریدا اور اخبار کی سُرخیاں پڑھتا ہوا ویٹنگ روم میں آیا، ویٹنگ رُوم میں آکر اُس نے دیکھا کہ ایک لڑکی بیہوش پڑی ہے اور ایک کاغذ اس کے سامنے رکھا ہے، اُس نے کاغذ پڑھنا شروع کیا اُس میں لکھا تھا:-

پتاجی! میری وجہ سے آپ کو ذلت اُٹھانا پڑی میں آپ کو اب اور زیادہ ذلیل ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی -! یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مکان میں آگ اتفاقیہ طور پر لگی اور اسی آگ نے میرے خوبصورت چہرے کو اس قدر بدنما بنا دیا کہ کوئی شخص مجھ سے بیاہ کرنے کو تیار نہیں ہے -! اس میں میرا کیا قصور ہے! میں اپنے چہرے کے داغوں کو دُور نہیں کر سکتی اور جب تک یہ داغ میرے چہرے پر باقی ہیں مجھے کوئی مرد قبول نہیں کر سکتا! میں شادی کے بغیر آپ کے یہاں بہت خوشی کے ساتھ رہ سکتی ہوں مگر ہندوستان کی سوسائٹی میں جوان بیٹی کا اس طرح گھر بیٹھے رہنا ذلت اور رُسوائی کا باعث سمجھا جاتا ہے! اب میرے لئے ایک ہی راستہ ہے..... ! خودکشی -! آپ کو اس خبر سے یقیناً دُکھ ہوگا لیکن اس غمِ مستقل سے یہ تھوڑی دیر کا غم اچھا ہے -! میں آپ ہی کا بوجھ ہلکا کرنے کیلئے ایسا کر رہی ہوں - ماتاجی کو پرنام -! ان سے کہیئے کہ وہ اپنی نالائق اور بدنصیب بیٹی کی خطاؤں کو مُعاف کر دیں -!

ہاں! آپ سے میری آخری عرض یہ ہے کہ مجھے جس نوجوان نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر آگ سے نکالا تھا اگر اس کا پتہ لگ جائے تو میرا یہ پیام اس تک پہنچا دیجیے

کہ میں تمہاری مہربانی کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی ــ! تم نے میرے ساتھ نیکی کی تھی مگر خود غرض دنیا نے اس نیکی کو خود کشی کی منزل تک پہونچا دیا۔

پتاجی! میرے ہاتھ کانپ رہے ہیں، مجھ سے لکھا نہیں جاتا تین گھنٹے بعد ٹرین آئے گی اور آپ کسی اخبار میں پڑھ لیں گے کہ داغدار چہرے والی انجن کی زد میں آکر مر گئی ــــــ! "شانتی"......

شدتِ جذبات نے شانتی کو بیہوش کر دیا تھا، کشور خط پڑھ کر سب کچھ سمجھ گیا۔ آتش زنی کا حادثہ اُس کی نگاہوں کے سامنے تھا، اُس نے شانتی کو اُٹھا کر ویٹنگ رُوم کی کوچ پر لٹا دیا، ویٹنگ رُوم کے نل سے چلّوؤں میں پانی لایا شانتی کے منہ پر پانی چھڑکا، تھوڑی دیر میں شانتی نے آنکھیں کھول دیں اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان جس کے چہرے پر بھی سفید سفید داغ ہیں، سرہانے کھڑا ہوا ہی، شانتی اُٹھتے ہوئے بولی :۔

ارے! تمہارے چہرے پر بھی میرے چہرے کی طرح داغ ہیں ــــــ! تم کون ہو اور میں کہاں ہوں ــــــ!

کشور نے شانتی کو گلے لگایا اور اس کے بالوں کو چہرے سے ہٹاتے ہوئے بولا۔

ہم دونوں ایک ہی آگ کے جلے ہوئے ہیں، اب ہم ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتے ــــــ!

شانتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اُس کے چہرے کے داغ پھولوں سے زیادہ شاداب نظر آتے تھے ــــــ!

رنگین تجربے

اعظم شروع ہی سے فلسفیانہ باتوں میں دل چسپی لیتا تھا۔ بڑے ہو کر یہ دل چسپی جنون میں تبدیل ہو گئی، اس کے ارد گرد فلسفہ کی کتابیں دھری رہتیں اور ہمیشہ غور و فکر میں مستغرق رہتا، گہرے سوچ اور شدتِ فکر نے اُس کے چہرے کو خشک اور رُوکھا بنا دیا تھا۔ فلسفیوں کو لوگ نیم پاگل کہتے ہیں اور اعظم کا استغراق اس حد سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ شیروانی کے بٹن کھلے ہوتے اور وہ بھی اس طرح کہ نیچے کا چوتھا بٹن اوپر کے دوسرے کاج میں اٹکا ہوا، گریبان پر پان کے دھبے، پاجامے میں سلوٹیں پڑی ہوئیں، اُلجھے ہوئے بال، پراگندہ صورت کسی طرف دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہا، ابھی ٹوپی سر پر ہے اور تھوڑی دیر میں اسے بغل میں دبا لیا اور اس کے بعد نہ جانے کیا جی میں آئی کہ ٹوپی توڑ مروڑ کر شیروانی کی جیب میں رکھ لی۔ اس کی ان حرکتوں پر لوگ ہنستے تھے مگر اس ہنسی میں جذبہ احترام بھی شامل تھا، اس کے تبحرِ علمی کے سب قایل تھے۔

وہ ہمیشہ سوچا رہتا کہ قدرت نے اپنی مصلحتوں کو اتنا پیچیدہ نا قابلِ فہم اور شاخ در شاخ کیوں بنا دیا ہے۔ وہ انسان جس کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا

جس کو سب خُلاصہ کائنات کہتے ہیں، اتنا بھی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا اور اندر جانے والی سانس باہر پلٹ کر آئے گی بھی یا نہیں! تاریکی مسلسل تاریکی، بے خبری پیدائش سے لیکر موت تک بے خبری! نہ بچپن ہی میں کچھ معلوم ہوا، نہ جوانی نے کچھ بتایا اور نہ بڑھاپا کسی گتھی کو سُلجھا سکا بڑے بڑے اہل معرفت:-

حدیث از مُطرب دمے گو زرازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّا!

کہہ کر اعترافِ عجز کے عالم میں دُنیا سے چلے گئے - ایک طرف یہ بے خبری اور کم آگہی اور دوسری طرف غم و مسرت کا یہ طلسمی نظام کہ مسکراہٹوں کے پیچھے آنسوؤں کی قطار در قطار فوجیں، بہار کا دامن خزاں سے بندھا ہوا، شگفتگی کی رُوح میں پژمردگی کے جراثیم اور زندگی کے دل میں موت کا کانٹا چُبھا ہوا۔ نہ خوشی کو ہمیشگی اور نہ غم کو دوام کسی کے یہاں دو دو دن چُولھا گرم نہیں ہوتا اور کہیں دن رات دیگیں کھڑکتی ہیں، کہیں غم کے شادیانے اور کسی جگہ ماتم کی صدائیں ؎

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے

انسان کا وجدان یقین اور شک کے درمیان جھولتا رہتا ہے، کوئی چیز یقینی اور قطعی نظر نہیں آتی۔ چلتی پھرتی پرچھائیوں کو لوگوں نے حقائق سمجھ رکھا ہے۔ دنیا والے پانی کے بلبلوں کو جام و مینا سمجھ کر ان کی طرف دوڑتے ہیں، اوس کی بوندوں سے پیاس بجھانے کی کوشش کی جاتی ہے، سورج کی کرنوں کو مٹھیوں میں بند کرنے کے ارادے کئے جاتے ہیں -!
آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے زبانوں پر مُہریں لگی ہوئیں فکر محدُود، عقل شکستہ پا، خیال مستعار، تصور پابند، ارادہ مُقید اور پھر قیامت یہ کہ عمل پر احتساب یہ بھُول چُوک

کیوں ہوئی، ایسا کیوں کیا، فلاں بات ذہن میں کیوں آئی ــ طوفانوں میں ڈالکر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ دیکھنا سرِ دامن بھی بھیگنے نہ پائے، کانٹوں میں گھسیٹ کر توقع کی جاتی ہے کہ جسم پر ذراسی خراش بھی نہ آئے ــــ! یہ کیا فلسفہ ہے، یہ کونسا نظام ہے؟ حضرت موسیٰ کلیم اللہ کی جگہ اگر میں ہوتا تو "ربِ ارنی" کہنے سے پہلے عرض کرتا کہ اے خشک و تر کے مالک! دُنیا کو بگاڑنے کے لئے کیوں بنایا تھا اور انسان کو اگر عقل دی تھی تو ایک ایک راز کو بے نقاب ہو جانا چاہیئے تھا۔

اعظم ایک طرف فلسفی اور دوسری طرف مذہبی تھا۔ ان خیالات کے بعد وہ توبہ کرتا، روتا اور سجدے میں گڑگڑا کر کہتا کہ اے بارِ الٰہا! میں توبہ کرتا ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی ــــ! میں نادان ہوں گنہگار ہوں، تیرا ہر حکم بے چون و چرا ماننے کے قابل ہے، تیرے وعدے سچے، تیرا نظام محکم اور تیرا قانون عدل و انصاف کی جان ہے ہوس اور تمنا کے "نشاطِ کار" ہی میں لطف ہے اور ؎

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

لکیروں کو مصور اور نقاش سے پوچھنے کا حق نہیں ہے کہ ہمیں چھوٹا بڑا ترچھا سیدھا کیوں بنایا اور لکیریں بنا بنا کر کیوں مٹائی جاتی ہیں، لکیریں مصور کی مصلحت کو نہیں سمجھ سکتیں ــــ! میرے مالک! تیری قدرت اور مشیت کے عدل و توازن پر میرا ایمان ہے، اللہ! میری توبہ کو قبول کر میرے گناہوں کو معاف کر دے، یقین کی سرمدی دولت سے مجھے نواز دے ــــ!

اعظم کا دل مذہبی اور دماغ فلسفی تھا۔ فلسفہ شک پیدا کرتا ہے فلسفہ کی جماعتِ مُستیقنین کے اماموں اور پیشواؤں کے یہاں بھی تشکیک پائی جاتی ہے اور متشککین کا تو یہ

عالم ہے کہ وہ تو دو اور دو (۲ + ۲ = ۴) کو چار کہتے ہوئے بھی جھجکتے ہیں۔ اعظم بھی شک سے نہیں بچ سکا مگر اس کا شک کبھی یقین نہیں بنا، مذہبی معتقدات شک کی تاریکیوں کو دُور کرتے رہتے۔ ایک طرف ابن رُشد اور بو علی سینا کے خیالات پر اس کی نظر تھی اور دوسری طرف امام غزالیؒ اور شاہ ولی اللہؒ کی تعلیمات اُس کے دل میں بسی ہوئی تھیں اعظم سوار تو ایک ہی کشتی پر تھا —— مذہب کی کشتی پر —— مگر فلسفہ کی کشتی کا بادبان اُس کی نگاہ میں تھا —! اُس بادبان کی گردش کیسا تھ کبھی کبھی وہ خود بھی گھومنے لگتا —!

اعظم جدت پسند اور تنوع کا شایق بھی تھا، کتابوں کے مُطالعہ سے اُسکو بے حد دلچسپی تھی، پڑھے لکھے آدمیوں سے اُس کی دوستی کتابوں کے لئے تھی مانگ کر کتابیں لاتا اور پڑھ کر واپس کر دیتا اُس کی بیشمار راتیں چراغ کی روشنی میں کتابوں کے سہارے بسر ہوئی تھیں، بعض دوستوں نے کہا کہ اتنا مطالعہ نہ کیا کرو، بینائی کم زور ہو جائے گی۔ اعظم نے جواب دیا کہ قدرت نے آنکھیں کتابیں پڑھنے کے لئے ہی دی ہیں، اگر یہ مطالعہ میں کام آجائیں تو یہ سمجھو کہ آنکھوں کا صحیح حق ادا ہو گیا۔ رات کو مطالعہ کئے بغیر وہ سو ہی نہ سکتا تھا۔

علم النفس کے مُطالعہ کے بعد اُسے لوگوں سے ملنے بات چیت کرنے اور انکی نقل و حرکت دیکھنے اور ان کی نفسیات پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا۔ کسی شخص سے وہ ملتا تو اُس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک ادا کو غور سے دیکھتا کہ اُس نے سلام کس طرح کیا، بات کرتے میں اُس کی گردن کتنی مرتبہ ہلی، اپنی تعریف سُن کر اُسکے چہرے پر کس قسم کے آثار ظاہر ہوئے، اعظم ہر شخص سے ملنے کے بعد اپنی کتاب یادداشت

میں ضروری باتیں ملتا۔ اُس کی ڈائری کے ضروری اقتباسات اگر یہاں درج نہ کئے جائیں گے تو افسانہ پڑھنے والوں پر بڑا ظلم ہوگا اور کوئی افسانہ نگار اپنے افسانہ خوانوں کے ساتھ ناانصافی، ظلم اور کوتاہی روا نہیں رکھ سکتا :-

——— میری آج ایک شاعر سے ملاقات ہوئی۔ شب کے مشاعرے میں اُس شاعر کی غزل بہت کامیاب رہی تھی اُس نے مجھ سے دریافت کیا :-

"کہیئے ! رات کا مشاعرہ کیسا رہا ———"!

وہ دراصل میری زبان سے اپنی تعریف سُننا چاہتا تھا کہ جب مشاعرے کا ذکر آئے گا تو اس کی غزل کی کامیابی کا بھی تذکرہ ہوگا ! میں نے اُسکے دل کی چوری پکڑنے کے لئے مشاعرے کا ذکر بہت تفصیل سے کیا مگر اس کا نام تک نہ لیا، اُس پر وہ بولا :-

——— میں جب غزل پڑھ رہا تھا اس وقت کیا آپ وہاں تشریف فرما تھے میں نے کہا کہ کیا تم میری زبان سے اپنی تعریف سُننا چاہتے ہو وہ بولا کہ نہیں میرا مقصد یہ نہیں ہے۔ میں نے کہا تم جھوٹے اور مکّار ہو، مشاعرے کا ذکر چھیڑنے سے تمھارا مقصد ہی یہ تھا کہ تمہاری غزل کی تعریف کی جائے ورنہ جب مشاعرے میں تم بھی تھے اور میں بھی تھا تو مشاعرے کی تفصیل پوچھنے کی کیا ضرورت تھی اُس پر وہ شاعر جھینپ کر خاموش ہو گیا۔

——— آج ایک افسر سے مُلاقات ہوئی جس نے از خود یہ تذکرہ چھیڑا ،۔

"بھئی اعظم ! میری طبیعت آج کسلمند ہو، بات یہ ہوئی رات وزیر اعظم نے کھانے پر بلایا تھا، وہاں بہت دیر ہو گئی گھر آیا ہوں تو کوئی تین کا عمل تھا بے خوابی

کے سبب طبیعت خراب ہو گئی۔"

مجھ سے نہ رہا گیا میں نے ان عہدیدار صاحب سے کہا کہ آپ بالکل اچھے اور تندرست ہیں۔ یہ داستان آپ نے صرف رعب جمانے کے لئے سنائی ہی مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ وزیراعظم بہادر کے یہاں دعوت میں تشریف لے گئے تھے اسپر وہ صاحب گھبرا کر بولے کہ آپ مجھ پر تہمت جوڑتے ہیں، میرا یہ مطلب ہرگز نہ تھا میں نے کہا کہ آپ کا یہی مقصد تھا اور میں اپنی بات کی صداقت کے لئے قرآن اُٹھانے کو تیار رہوں۔

——— میں ایک قومی لیڈر سے ملنے کے لئے گیا، وہ باتوں میں اپنے دورے کا حال سناتے ہوئے بولے:-

"میری تقریر میں غیر معمولی اجتماع تھا کلکتہ کے لوگ کہتے تھے کہ اتنا بڑا مجمع آج تک کسی لیڈر کی تقریر میں بھی نہیں ہوا ———"!

میں اس پر مسکرایا اور بولا کہ جناب معاف فرمائیے مجھے کچھ عرض کرنا ہے وہ بولے کہئے میں ہمہ تن گوش ہوں، میں نے کہا کہ میرے پاس اُن لوگوں کے کئی خط آئے ہیں جو خود آپ کے جلسہ میں موجود تھے، مجمع واقعی اچھا خاصا تھا مگر یہ جملہ کہ "کلکتہ کے لوگ کہتے تھے" یہ آپ ہی کی حسین ایجاد ہے ———!

جس قول کو کلکتہ والوں کے قول سے منسوب کیا گیا ہو وہ خود آپ کا ذاتی قول ہے اس پر وہ پیشوائے قوم جھنجلا کر بولا کہ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ میں آپ کو نہ سچا کہتا ہوں اور نہ جھوٹا ———! مگر یہ جملہ آپ ہی کا طبع زاد ہی، کلکتہ والوں نے ایسا نہیں کہا۔

ایک مولوی صاحب نے مجھے خط میں لکھا:-

"اعظم صاحب! آپ کے خط کے جواب میں بہت تاخیر ہوگئی آج کل بہت مصروف ہوں، بڑی مشکل سے نمازِ تہجّد کے بعد جواب دینے کے لئے وقت نکالا ہے"۔

میں نے مولوی صاحب کو جواب دیا کہ آپ نے نمازِ تہجّد کا اعلان کر کے اپنی نماز کو بھی برباد کر دیا۔ نیکیوں اور عبادتوں کا اعلان کرنے سے تو شاید وہ گناہ اچھے ہیں جو ڈر کر اور چھپ کر کئے جاتے ہیں۔

ایک نہایت ہی خوبصورت خاتون سے ایک دعوت میں ملاقات ہوئی تصویروں کا ذکر چھڑ گیا وہ عورت بولی:-

ہم جیسے بدصورت لوگوں کی تصویر اچھی کیوں آنے لگی!

میں نے کہا کہ آپ نے یہ جملہ کسی اور نیت سے کہا ہے ورنہ آپ خوبصورت ہیں اور خود آپ کو بھی اس کا احساس ہے! آپ کا اپنے کو بدصورت کہنے سے یہ مقصد ہے کہ لوگ آپ کے حُسن کی تعریف کریں کہ نہیں یہ غلط ہے آپ تو بہت حسین اور چندے ماہتاب اور چندے آفتاب ہیں۔

اعظم کی یہ نفسیاتی ڈائری جس کے چند اقتباسات اوپر درج کئے گئے ہیں، بہت ہی پُر لطف اور مفید چیز تھی سینکڑوں ایسے نفسیاتی اشارے جو علم النفس کی کتابوں میں نہیں پائے جاتے اس میں موجود تھے۔

اعظم نفسیات کا ماہر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جس شخص سے بھی ملتا اس کی ایک ایک حرکت کو غور سے دیکھتا بلکہ اُس میں گم ہو جاتا۔ ایک دعوت میں اس کی ایک خاتون سے مُلاقات ہوئی دوہرے جسم کی دیدہ زیب عورت تھی، کانوں کے آویزوں کی

چمک نے اُس کی دیدہ زیبی کو اور چار چاند لگا دیئے تھے، اس عورت کا شوہر بھی اُس کے ساتھ تھا۔ اعظم اپنی عادت کے موافق عورت کو نہایت غور سے دیکھنے لگا وہ عورت کو مسلسل دیکھے جا رہا تھا اور لوگ تو کھانے پینے میں مصروف تھے مگر اُس خاتون کے شوہر کی اعظم پر نظر تھی کہ ایک غیر مرد اُس کی بیوی پر نگاہیں ڈال رہا ہے اور اس کے ذوق شوق کا یہ عالم ہے کہ ایک لمحہ کے لئے نگاہ نہیں ہٹتی!

عورت کے شوہر کی آنکھوں میں عتاب اور خفگی جھلک رہی تھی اسکی بیوی لاکھ بے پردہ سہی مگر کوئی شوہر اس کو برداشت نہیں کرسکتا کہ غیر مرد اس کی بیوی پر بُری نگاہیں ڈالے اس قسم کی نظارہ بازی اکثر رقابت اور انتقام کی آتش بازی ثابت ہوئی ہے۔ اعظم عورت کو دیکھکر جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا معلوم کرچکا تھا اب اُس نے اس عورت کو دیکھنا چھوڑ دیا اور کھانا کھلانے والے ملازم پر آنکھیں گاڑ دیں وہ مُلازم کو اُسی انہماک اور استغراق کے ساتھ دیکھنے لگا جس طرح عورت کو دیکھ رہا تھا۔ عورت کا شوہر یا تو غصہ میں بھرا بیٹھا تھا یا پھر مُسکرا دیا اُس نے اپنے قریب کے آدمی سی پوچھا کہ یہ کون شخص ہے، آدمی نے کہا کہ یہ ہمارے شہر کے مشہور فلسفی مسٹر اعظم ہیں۔!

کھانا کھانے کے بعد وہ شخص اعظم سے بات چیت کرنے کے لئے اُس کے قریب آگیا اور سلام اور مزاج پرسی کے بعد بولا:۔

—— آپ لوگوں کو غور سے کیوں دیکھا کرتے ہیں۔

اعظم نے جواب دیا:۔

—— میں لوگوں کو دیکھتا نہیں پڑھتا ہوں۔

اُس آدمی نے جواب میں کہا:۔

مجھے بھی پڑھا آپ نے ——— !

اعظم بولا :-

——— جی ہاں ! آپ کو تو ایک نظر ہی میں پڑھ لیا ، آپ نے کانٹے نکالنے کی زحمت سے بچنے کے لئے مچھلی کو ہاتھ تک نہیں لگایا ، آپ دشواری اور محنت سے گھبراتے ہیں ۔ ایسا آدمی زندگی میں کامیاب نہیں ہوسکتا ، آپ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہندوستان میں بیٹھے ہوئے ڈربی کی گھوڑ دوڑ کھیلتے ہیں کہ دس روپیہ میں دس لاکھ روپیہ مل جائے ۔

وہ آدمی اعظم کی باتیں سُنکر متحیر ہوگیا اور جھینپ کر بولا :-

جی میں نہیں ——— ! میری بیوی کو گھوڑ دوڑ کا شوق ہے وہی لاٹریوں میں پیسہ لگاتی رہتی ہے ——— !

اعظم کو فلسفہ کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی حسین اور شوخ عورتوں کے مجمع میں وہ اس طرح بےحس وحرکت بیٹھا رہتا جیسے اس کے پہلو میں دل ہی نہیں ہے جنسی کشش سے اُس کی زندگی خالی تھی ، شدید استغراق اور غیر معمولی انہماک نے اسکے جنسی جذبات پر غلبہ پالیا تھا ، وہ کہا کرتا تھا کہ حُسن اُس چیز میں نہیں ہے جسے تم دیکھتے ہو بلکہ حُسن خود تمہاری نگاہ میں ہے ۔ ادھر ذوقِ دید سیراب ہوا اور دیکھنے کا شوق جاتا رہا ——— ! اعظم کے جذبات کا ساز ہمیشہ سے خاموش تھا ، نغمے تو اس میں تھے مگر تیز تر مضراب کی ضرورت تھی ——— !

اعظم ایک دن کمپنی باغ میں ٹہل رہا تھا ایک نہایت ہی حسین لڑکی فوارے کے پانی سے کھیل رہی تھی ، لڑکی بہت حسین تھی اور شباب کا تو یہ عالم تھا کہ بلاؤں کے

تار ٹوٹے جاتے تھے۔ پانی میں بھیگ جانیسے مہین کپڑا چاند اور کتاں کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اعظم نے دیکھا کہ لڑکی نے پانی اچھالتے ہوئے سینہ کو پوری قوت سے اُبھارا گردن سے بہت نیچے تک سپیدی جھلک رہی تھی۔ اعظم نے ایک جُھرجُھری سی لی جیسے کسی نے اُس کے تلووں کو سہلا دیا، لڑکی اعظم کو دیکھ کر ساری کا پلّو سینہ پر ڈالتے ہوئے بولی:۔

ہائیں! سب کچھ دیکھ لیا.... ! مجھے اتنا غافل نہ ہونا چاہیئے تھا۔!

لڑکی کمپنی باغ سے روانہ ہوئی اور اعظم نے بھی اس کا پیچھا کیا۔ راستے میں دو چار جاننے والے ملے وہ اعظم کو دیکھ کر کہنے لگے:۔ اعظم صاحب! بھئی افلاطون نے اپنی جمہوریت میں وہ دریائی سفر کی کیا مثال دی یا تو اعظم فلسفہ پر گھنٹوں بحث کیا کرتا تھا اور اب بولا:۔

کتاب پڑھو معلوم ہو جائے گا۔ تمام دنیا کی باتیں پوچھنے کے لئے میں ہی رہ گیا ہوں —!

اعظم لڑکی کے پیچھے چلتا رہا لڑکی ایک بنگلہ میں گھس گئی اور اعظم اپنے مکان کو چلا آیا۔

گھر آکر اعظم نے خود کو لعنت ملامت کی کہ مجھے ایسا نہ کرنا چاہیئے تھا آدمی کو ضبط سے کام لینا چاہیئے یہ کیا کہ ذرا کسی اچھی صورت کو دیکھا اور اس کے پیچھے ہو لئے یہ تو بازاری آدمیوں کی زندگی ہے۔ یہ اس کی عقل کا فیصلہ تھا مگر دل کہتا تھا کہ ؎

گرچہ بدنامیست نزدِ عاقلاں
مانمی خواہیم ننگ و نام را

نگاہ دیکھنے اور دل محبت کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ دل اور دماغ میں بہت دیر تک جنگ ہوتی رہی آخر فیصلہ یہ ہوا کہ بس ایک مرتبہ اُس لڑکی کو دیکھنے کے بعد توبہ کرلی جائے۔!

اعظم دوسرے دن لڑکی کے بنگلہ کے سامنے کئی گھنٹے کھڑا رہا مگر وہ قتالۂ عالم نظر ہی نہ آئی، اعظم ناکام واپس آگیا اس ناکامی نے جذبۂ شوق کو اور تیز کردیا۔ عقل نے کہا کہ اب جانا مناسب نہیں، دل نے جواب دیا کہ ایک مرتبہ دیکھنے کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ اس مرتبہ لڑکی نظر ہی نہیں آئی، فیصلہ اور اُس کی حجت اپنی جگہ بدستور قایم ہے۔

اعظم کے جذبات کا ساز جس مضراب کا منتظر تھا اُس کی چوٹ پڑ چکی تھی، اُس کے تصوّرات پر وہی لڑکی چھائی ہوئی تھی۔ کتابوں کے مطالعہ میں اس نے کمی کردی، یا تو وہ عالم کہ کتاب ہاتھ میں اُٹھائی تو ختم کرکے دم لیا اور اب یہ صورت ہوگئی کہ کتاب کے دو چار ورق پڑھے کتاب اُلٹ پلٹ کر رکھ دی اور کمپنی باغ کے منظر کے اردگرد اُس کے تصوّرات گھومنے لگے۔!

اعظم دوسرے دن لڑکی کے بنگلہ کے سامنے جانے کے تیار ہوا تو خود ہی کچھ سوچ کر کہنے لگا ارے! وہ فیشن ایبل لڑکی مجھے ان شکن آلود اور میلے کپڑوں میں دیکھ کر کیا کہے گی! حجامت بنوائی گئی، کپڑے بدلے گئے اور اعظم خوب بن سنور کر دیارِ محبوب کی طرف روانہ ہوا، لڑکی کی ایک جھلک سی نظر آئی وہ بھی اس طرح کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ موٹر میں بیٹھ کر اعظم کے سامنے سے گذر گئی۔!

دل اور عقل میں سمجھوتا ہوا تھا کہ لڑکی کو ایک اور صرف ایک مرتبہ دیکھنے

کے بعد توبہ کرلیجائیگی مگراب دل نے کہا کہ اس طرح دُور سے دیکھنے میں کیا برائی ہی بعض فلسفیوں ہی کا قول ہی کہ خوبصورت چہرے دیکھنے سے تندرستی میں اضافہ ہوتا ہی۔ بہت سے فلسفیوں نے محبت کی ہی اور یونان کا علم الاصنام تو محبت کی داستان سے بھرا پڑا ہی۔ عقل نے بہت کچھ دلیلیں پیش کیں مگر حضرتِ دل نے کہا:۔

دوستو! مجھ کو محبت میں نصیحت نکرو　　اور کچھ روز یہی طرح گذر جانے دو

اعظم کے لباس اور وضع قطع میں اس قدر نمایاں تبدیلی دیکھکر دوستوں نے حیرت کا اظہار کیا تو اعظم بولا، قدرت کی دی ہوئی نعمتوں سے انسان کو پورا پورا فائدہ اُٹھانا چاہیئے ارسطو نہایت ہی قیمتی لباس پہنتا تھا۔ غرور اور سرکشی نہ ہو تو قیمتی لباس میں کیا بُرائی ہی آدمی کو ہر وقت چاق چوبند رہنا چاہیئے۔ فلسفہ بہت خشک سہی لیکن لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ لذت بھی فلسفہ کا نہایت ہی اہم موضوع ہی، خوش پوشاکی بھی ایک طرح کی لذت ہے،

اعظم ایکدن بن سنور کر لڑکی کے بنگلہ پر پہنچا، بنگلہ میں مہمانوں کی بھیڑ تھی، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ڈپٹی صاحب کی لڑکی کی بارات آئی تھی، آج صبح رخصت ہوگئی، اعظم نے یہ خبر سُنکر خلش سی محسوس کی وہ بنگلہ کے در و دیوار پر مایوسانہ نگاہ ڈالتے ہوئے گھر واپس چلا آیا عقل نے کہا کہ دیکھا! کیسی ناکامی ہوئی، دل بولا کہ ایک تجربہ کا اضافہ ہوگیا۔ اعشق تھا ہی نہیں جو ناکامی کے بعد اور پاؤں پھیلاتا، جذبات کا ساز ایک آدھ نغمہ سُناکر خاموش ہوگیا!

کچھ دن کے بعد اعظم کو اس کے مکان میں دیکھا گیا کہ پہلے کی طرح گریبان پر پان کے دھبے پڑے ہیں، بال اُلجھے ہوئے ہیں اور کتاب پڑھتے ہوئے آہستہ آہستہ کہہ رہا ہی۔

علتِ غائی دراصل علۃ العلل ہی کا پرتو ہی۔!

طُوفان

رومتہ الکبریٰ کی حکومت شباب پر ہے دُنیا کی کوئی سلطنت اس سے ٹکر لینے کی جرأت نہیں کر سکتی۔ مشرق و مغرب میں رومتہ الکبریٰ کی سطوت و جبروت کے پرچم لہرا رہے ہیں۔ رومی مورخوں کے قلم کی ہر جنبش مداحی اور مبالغہ کے لئے وقف ہے۔ شعرار قصیدے سُنا رہے ہیں کہ آج تک روئے زمین پر اتنی طاقتور شہنشاہی قائم نہیں ہوئی اور قایم کیسے ہوتی جبکہ آسمانی دیوتاؤں کی تائید ازل کے دن صرف رُوم کے لئے مقرر کر دی گئی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ مقدس کتابوں میں لکھا ہے کہ لالہ و گل اور لعل و گہر دنیا میں اسی لئے پیدا کیے گئے ہیں کہ رومتہ الکبریٰ کے عالی شان قصر کی زینت و آرایش میں صرف ہوں۔ دُنیا کی پیدایش سے پہلے خدا کا تخت پانی پر تھا اور اب زمین پر ہے، خدا نے اس شرف کے لئے رُوم کی زمین کو منتخب فرمایا ہے شاعروں، افسانہ نگاروں اور مورخوں نے مُبالغہ کا ایک طلسم کھڑا کر دیا اور یہ طلسم شہنشاہ کے طِلسمی قصر و ایوان سے زیادہ حیرت انگیز اور پُر فریب تھا۔!

علم و فن کے تمام جواہر رُوم میں سمٹ کر آ گئے تھے۔ بُت تراشی کا یہ عالم کہ پتھر کے ٹکڑوں میں جان ڈال دی گئی، نقاشوں کا ہر نقش بولتا ہوا معجزہ تھا، فن خطاطی

کے ماہر خطِ تمثال اور خطِ مسماری میں ربطِ تام پیدا کر کے ایک نئے رسم الخط کی بنیاد ڈال رہے تھے۔ فلسفیوں کی درسگاہیں عوام کے لئے کھلی ہوئی تھیں۔ یونان کے کھردرے اور مبہم فلسفے کو ہموار اور قابلِ فہم بنایا جا رہا تھا۔ فنِ تعمیر حُسن و تناسب کے اس نقطۂ پر تھا جسکے بعد کہکشاں اور قوس قزح ہی کی منزل شروع ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی تمدن کو آج تک اتنا عروج نصیب نہیں ہوا اور تہذیب کی دُلہن اس انداز سے کبھی نہیں سنواری گئی۔ چشمِ آفتاب نے اس جہانِ رنگ و بُو میں کیا کیا نہیں دیکھا مگر رومتہ الکبریٰ کے حسن و جمال کو دیکھنے کے بعد اُس کی قوتِ مشاہدہ نے کہہ دیا کہ اب کسی اور نظارے کی ہوس نہیں رہی۔

شہنشاہ کی اکلوتی بیٹی کی آج سالگرہ تھی۔ حکومت کے طول و عرض میں جشن منایا جا رہا تھا۔ ایک ایک قریہ میں خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ گاؤں کے لوگ انگور کی بیلوں کے سایہ میں جام و مینا چھلکا رہے تھے۔ حکومت کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ ایک ایک خس پوش جھونپڑے سے چنگ و رباب کی صدائیں بلند ہونی چاہئیں، خوشی مناؤ، رقص کرو، گاؤ بجاؤ، شرابیں پیو یہاں تک کہ حُسن و مسرّت کی مقدس دیوی تم سے خوش ہو کر مسکرا دے۔ حُسن و مسرت کی دیوی کو سال میں ایک دفعہ ضرور مسکرانا چاہیئے۔ ورنہ مہر و ماہ کے چراغ گل ہو جائیں گے اور ستاروں کی چمک ماند پڑ جائے گی ۔! اس عیش و عشرت کے پیچھے مذہبی عقیدت بھی کام کر رہی تھی اور یہ افسانے ان مذہبی پیشواؤں کے گھڑے ہوئے تھے جنکو سالگرہ کے موقع پر شہنشاہ کے دربار سے بیش بہا تحائف عطا ہوتے تھے۔

ایوانِ شاہی کی زیب و زینت کا کیا پوچھنا۔ آسمانی جنت سچ مچ زمین پر اتر آئی

تھی۔ قصر کی ایک ایک محراب کو سنوارا گیا۔ پھول کی ایک ایک پتی کو دھویا گیا دیواروں پر ہی نہیں پودوں کی شاخوں پر کافوری شمعیں روشن تھیں جن کے عکس نے پانی کے حوض کو چاند تاروں کی سطح بنا دیا تھا۔ محرابوں کے زرین پردوں کی جنبش اور کافوری شمعوں کی لرزش ملجلکر بام و در کو نورِ رواں اور تابشِ سیّال بنا رہی تھی۔ چمن کے طلائی فوارے مرمریں فرش پر موتی برسا رہے تھے شمعدانوں کو حوض کی تہ میں اس طرح نصب کیا تھا گویا پانی روشنی کی سطح پر ٹھیرا ہوا ہو۔ قصر شاہی میں غیر معمولی چہل پہل تھی۔ ایک ایک ذرّہ سے مسرت اُبل رہی تھی۔ قصر اور قصر کے خوش قسمت ساکن عیش و مسرت میں غرق تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے گردشِ روزگار کو ایک رات کے لئے ٹھیرا دیا گیا اور غمِ ماضی اور فکرِ فردا کے تخیل کو تیز سی شراب پلاکر اس طرح مخمور کیا کہ طلوعِ صبح تک ہوش آئے تو آئے۔

حرم سرا کی مہتابی سے ایک خوبصورت کنیز باہر آئی اور نفیری بجاکر بولی شاہزادی صاحبہ غسل فرما چکی ہیں آرائش گاہ میں لباس تبدیل فرما رہی ہیں ——!

شاہزادی حمّام سے اس طرح برآمد ہوئی کہ بھیگے ہوئے بالوں کو نوخیز چھوکریاں نرم و حسین چادروں میں اُٹھائے ہوئے تھیں۔ حریری لباس سے جسم کی سُرخی چھن رہی تھی۔ آثارِ شباب آئینوں کے دلوں میں اُترے جا رہے تھے۔ جسم کا تناسُب مرمریں مجسّموں سے داد طلب کر رہا تھا۔ جوانی کے بھیگے ہوئے شعلۂ حُسن کی آتشِ نمناک آرائش گاہ میں پہنچی، یہاں مشاطائیں شاہزادی کا انتظار کر رہی تھیں۔ شاہزادی قدِ آدم آئینہ کے روبرو کھڑی ہو گئی۔ حریر کا حباب آسا لباس بھی اتار دیا گیا اور اب جوانی اُس منزل میں تھی جہاں قوتِ مشاہدہ کو پسینہ آجاتا ہے حُسن و شباب

کی روح آئینہ میں کھنچ آئی تھی۔ سکندر کی قوتِ ایجاد کو وجد آرہا تھا۔ شاہزادی نے بھیگے ہوئے بالوں کو جھٹکا پانی کے قطرے آئینہ پر گر گئے۔ جوانی مسکرا رہی تھی، حُسن جھوم رہا تھا، شعلے بھی تھے اور شبنم بھی، آئینہ آئینے کو دیکھ رہا تھا۔!

شاہزادی نے نہایت ہی مہین رومال سینہ پر ڈالتے ہوئے کنیزوں کو اشارہ کیا۔ کنیزیں سونے کے طباق اور چاندی کی صندوقچیاں لیکر حاضر ہوئیں، شاہزادی کو نہایت ہی زرق برق لباس پہنایا گیا۔ شاہزادی کا لباس ایران و شام کے صنّاعوں نے چاندنی راتوں میں تیار کیا تھا کہ اس جامہ رنگیں کی نازکی سُورج کی تیز کرنوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ لباس کا ایک حصّہ شفق سے زیادہ گلگوں تھا اور دوسرا حصّہ قوسِ قزح کی طرح رنگین، دُھوپ چھاؤں کو ایک دُوسرے میں سمو دیا گیا تھا۔ لباسِ فاخرہ کے بعد شاہزادی نے بیش بہا زیور پہنا۔ گردن کی مالائیں گوہرِ شب چراغ چمک رہے تھے اور ہاتھوں کے جڑاؤ کنگنوں کے ہیروں کی جوت دُور تک پڑتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ بحرِ رُوم سے لیکر الپس کے پہاڑوں تک کا علاقہ صِرف گلے کی مالا سے قیمت میں کمتر ہے۔

شاہزادی ایک تو خود ہی کافر ادا اور رنگین جمال تھی اور مشاطاؤں نے تو اسے سنوار کر قیامتِ مجسّم بنا دیا۔ وہ سر تا بقدم جلوۂ حیرت بھی تھی اور حیرتِ جلوہ بھی جوانی حُسن سے ہم آغوش تھی اور حُسن جوانی سے ہمکنار، مستیاں اور شوخیاں سچ مچ سمٹ کر انسان بن گئی تھیں۔ شاہزادی کے حسنِ تابناک کی قیامت آفرینی کو دیکھکر محسوس ہوتا تھا کہ دُنیا اس فتنۂ محشر کو شاید برداشت نہ کر سکے گی اور ڈر ہو کہ کہیں زمین کی طنابیں نہ ٹوٹ جائیں۔ حُسن اپنے مرکز کی طرف پرواز کرنے کے لئے تیار تھا۔

اِس طرف شاہزادی محوِ آرایش تھی اور اُس طرف دربار سجایا جارہا تھا۔ مدبّرِ اعظم تختِ شاہی کے قریب شامیانہ کی طلائی چوب تھامے کھڑا تھا۔ اُس کے دونوں طرف اعیانِ حکومت اور شرفاءِ سلطنت کی قطاریں تھیں، نقیب اور چوبدار اپنی اپنی جگہ ادب سے ایستادہ تھے۔ چوبداروں کی سنہری کلغیاں اور روپہلی پرتلے بہار دے رہے تھے۔ دربار کے عین وسط میں سونے کا فوارہ آبِ گل برسا رہا تھا۔ خوشبو کی لپٹیں فضا میں گھُل مل رہی تھیں۔ انگیٹھیوں میں عود وعنبر کیساتھ چنار کے آتش زدہ درختوں کی راکھ بھی سلگ رہی تھی جسے گلاب کی پتیوں کی اوس میں بسایا گیا تھا۔

ایوانِ خاص سے آواز آئی کہ شہنشاہ برآمد ہورہے ہیں۔ دربار میں سب لوگ ایستادہ ہوگئے۔ اُٹھتی ہوئی نگاہیں جُھک گئیں۔ کسی نے اپنے دامن کو درست کیا، کوئی عبا کے تکمے ٹھیک کرنے لگا، کسی نے تلوار کو ایک خاص ادا کیساتھ ہاتھ میں لیا۔ ایوانِ خاص سے حبشیوں کا ایک دستہ دربار کی طرف بڑھا۔ یہ شہنشاہ کا مقدمۃ الجیش تھا، حبشی سر سے پیر تک فولاد میں غرق تھے۔ بے نیام تلواریں، چمکتے ہوئے نیزے رقص کرتی ہوئی ڈھالیں، ان کے دیکھنے سے جلالتِ شاہی اور ہیبتِ خسروی دلوں پر نقش ہوئی جاتی تھی۔

تاکستان کے قریب شہنشاہ کی سواری پہنچی ہی تھی کہ شاہزادی شاہی رسم کے مُطابق عطر کی شیشی لیکر شہنشاہ کے روبرو آئی، شہنشاہ نے شاہزادی کو دیکھا آداب بجالائی اور عطر کی شیشی گذرانی، شہنشاہ نے عطر کی شیشی میں انگلی ڈال کر عطر کے قطرے پہلے ملکہ کی پیشانی پر ملے اور پھر شاہزادی کے رُخساروں کو چھُوا، شاہزادی اب شہنشاہ

کے جلوس میں تھی۔ شہنشاہ دربار میں پہنچا، دربانوں نے جھک کر آداب کیا، شاہنشاہ نے مسکرا کر جواب میں شمشیر جوہردار کو جنبش دی کہ تمہارے آداب کو قبول کر لیا گیا۔ اور تمہاری وفاداری اور جذبہ جاں نثاری کی ہم قدر کرتے ہیں۔ تخت شاہی پر شہنشاہ متمکن ہوا۔ سنہری کرسی پر ملکہ جلوہ افروز ہوئی اور روپہلی کرسی پر شاہزادی بیٹھ گئی ۔!

درباری فرطِ ادب سے آنکھیں جھکائے ہوئے تھے۔ رُعب شاہی نے انکی آنکھوں پر حجاب ڈال دیا تھا۔ شاہزادی کے حُسن وجمال کی تمام رعنائیاں بیکار جا رہی تھیں مرمریں ستونوں اور زرنگار آئینوں کے سوا کوئی دیکھنے والا ہی نہ تھا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے کہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا تو شاہزادی کی جوانی بھی اتنے بڑے ہجوم میں تنہائی محسوس کر رہی تھی۔ درباریوں کے سینہ میں شیشہ کے بیجان ٹکڑے نہیں حساس دل تھی مگر رعب شاہی نے حساس دلوں اور حُسن بیں نگاہوں کو بیکار کر دیا تھا، ہیبت شاہی اور جلالتِ خسروی شاہزادی پر ظلم کر رہی تھی۔ شاہزادی کا حُسن قدر شناس نگاہوں کا طلبگار تھا اور قدر شناس نگاہوں پر جلال سلطانی کے پہرے لگے ہوئے تھے۔

شہنشاہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا اور حسین چھوکریاں رقص کرنے لگیں۔ ان رقاصاؤں کے ہاتھوں میں سونے چاندی کی چنگیریں تھیں۔ ناچنے والیوں نے ساز کی سب سے تیز گت پر سونے چاندی کے پھول شاہزادی کے قدموں پر نچھاور کر دئے شاہزادی نے رقاصاؤں کو مسکرا کر دیکھا۔ چنگ و بربط بج رہے تھے، رقاصائیں ناچ رہی تھیں۔ شراب کے دور چل رہے تھے۔ آج شاہزادی کی سالگرہ تھی۔ مگر شاہزادی کچھ دل گرفتہ سی تھی، جیسے کسی کی کوئی دبی ہوئی تمنا دل ہی دل میں مچل رہی ہو اور وہ کسی خوف اور شرم سے اپنے دل کی بات کسی سے نہ کہہ سکے۔! جوانی۔ موتیوں کی مالاؤں اور اطلس و کمخواب

کے لباس سے مطمئن نہیں ہوتی، دُور کے جلوے شباب کو اور بیچین بناتے ہیں۔

رقص وسرود کے مختلف مناظر دربار میں پیش ہوئے، رقاصاؤں نے کافوری شمعیں سروں پر رکھ کر رقص طاؤس دکھایا۔ کوئی ناچنے میں دوہری ہوگئی، کسی نے رقص کرتے ہوئے تختِ شاہی کے خالی جام کو ہونٹوں سے اٹھالیا۔ ان سب کے بعد ایک حسین نوجوان دربار میں آیا اور نیزے کے چند کرتب دکھاکر ایک نہایت ہی حسین وشوخ اور فربہ اندام کنیز کے ساتھ رقص کرنے لگا۔ نوجوان نے کنیز کو آغوش میں لیا۔ کنیز نے آغوش سے نکلنے کی کوشش کی، نوجوان نے رقص کرتے ہوئے اسے اپنی طرف کھینچا، چھوکری نے نوجوان کا ہاتھ زور سے جھٹکا۔ دونوں میں کش مکش سی ہونے لگی مگر یہ کش مکش فنِ رقص کا کمال تھی۔ نوجوان کے ہر اقدام اور کنیز کی ہر مدافعت پر دھوکا ہوتا تھا کہ رقص اور نغمہ مجسّم ہو کر چل پھر رہے ہیں۔

شاہزادی کا سینہ اوپر نیچے ہونے لگا۔ اسکے جوان وگرم دل کی دھڑکن تیز ہوگئی، نتھنے پھڑکنے لگے۔ اُس نے کئی بار انگلیوں کو چٹخایا، انگلیاں چٹخنے کی آواز چنگ ورباب کے نغمے میں گھل ملکر رہ گئی۔ سردی کا زمانہ تھا، مگر شاہزادی کو پسینہ آگیا۔ برفانی فضا پر جذبات کی گرمی غالب آگئی۔ اُس کی مشتاق نگاہیں نوجوان پر جمی ہوئی تھیں۔ شاہزادی کا دل نوجوان کے پیروں کی دھمک کو محسُوس کر رہا تھا۔

نوجوان نے کنیز کو اپنی طرف کھینچا۔ کنیز نے بڑھکر نوجوان کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور نیزے کی انی نوجوان کے سینہ کی طرف کردی، یہ صرف تماشا اور اداکاری تھی۔ شاہزادی سے برداشت نہ ہوسکا وہ اپنی کُرسی سے اُٹھی اور کنیز کے ہاتھ کو روک دیا۔ اُس ہاتھ کو جس میں نیزہ تھا اور جس کی انی نوجوان کے سینہ کے بہت

قریب تھی۔ دربار میں تہلکہ مچ گیا، شہنشاہ کی آنکھیں غصہ سے سُرخ ہو گئیں۔ اُس نے گرجتی ہوئی آواز میں حکم دیا کہ دربار برخاست کیا جائے۔

شہنشاہ کے ایک اشارہ پر نوجوان کو پابہ زنجیر کر دیا گیا اور کنیزیں شاہزادی کے اِرد گرد ہو گئیں۔ سالگرہ کے جشن کی دُنیا ہی بدل گئی۔ ابھی رنگ رلیاں ہو رہی تھیں اور اب ہر طرف خوف و ہیبت چھا گئی۔ شہنشاہ اپنے خاص کمرے میں پہنچا شاہزادی طلب کی گئی۔

—— تم نے بھرے دربار میں میری عزّت کو خاک میں ملا دیا۔ شہنشاہ نے عتاب آمیز لہجہ میں کہا

—— شہنشاہ کی عزّت پر میں اپنی جان نچھاور کر سکتی ہوں ——

شاہزادی نے کانپتے ہوئے جواب دیا

—— ناسمجھ لڑکی مجھے دھوکا دینے اور بیوقوف بنانے کی کوشش نہ کر ——! مَیں یہ دریافت کرتا ہوں کہ بھرے دربار میں ایسی ناشائستہ حرکت کرنے کی جُرأت کِس طرح ہوئی —— شہنشاہ نے کہا

—— حضور! میں مجبور تھی، مجھ سے بالکل بے اختیاری کے عالم میں یہ فعل سرزد ہو گیا۔ مَیں نے یہ سمجھا کہ کنیز نیزے کی انی اُس نوجوان کے سینہ میں پیوست کر دیگی —— شاہزادی رُک رُک کر بولی۔

—— تو تجھے اُس نوجوان کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی —— شہنشاہ نے غصہ ہو کر جواب دیا۔

—— ایک انسان کی جان بچانے کے لئے ——! جہاں پناہ ——!

شاہزادی نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

ـــ اچھا.... سمجھا ـــــ ! ادھو کریو ـــــ ! شاہزادی کو شیش محل کے نیچے کے کمرے میں لیجاؤ۔ وہاں اس پر نگرانی رکھی جائے ـــــــ شہنشاہ نے حکم دیا اور شاہزادی کو کنیزوں نے اپنے حلقے میں لے لیا۔ وہی جسکے لئے جشن منایا جارہا تھا اب شاہی اسیر تھی ـــ خطا؟ ـــ قصور ـــــ ! یہی کہ اُس نے اپنی سادگی کے سبب یہ سمجھ کر کہ کنیز سچ مچ نوجوان کو نیزے سے زخمی کر دے گی ہکا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔

نوجوان بالکل بے گناہ تھا مگر اس جُرم میں کہ شاہزادی نے اُس سے اظہارِ ہمدردی کیوں کیا، غریب کو پا بہ زنجیر کر کے جزیرۂ مالٹا بھیجدیا گیا۔ اُس نے شاہی عہدیداروں سے دریافت کیا کہ مجھے کس جُرم کی پاداش میں جلا وطن کیا جارہا ہے۔ جواب ملا کہ ہم کچھ نہیں جانتے، شہنشاہ کا یہ حکم ہی اور فرمان شاہی کی مصلحتوں کی ٹوہ لگانا وفاداری کی توہین ہے جو حکم دیا گیا ہے اُس کی تعمیل کی جائے گی۔

شاہزادی پر چند دن تو شہنشاہ کا عتاب رہا پھر بادشاہ کا دل پسیجا اور بیٹی پر لگائی ہوئی تمام پابندیاں اُٹھادی گئیں۔ شاہزادی اب پہلے کی طرح آزاد تھی۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد شہنشاہ بہت سخت بیمار پڑا، ایک دن تو نبضیں ساقط ہوگئیں تھیں۔ اور قصرِ شاہی کا محافظ پرچم شاہی کو سرنگوں کرنے کے لئے قصر کے کنگرے پر پہنچ چکا تھا مگر ایک طبیب کی دوا نے مسیحائی کی، گیا ہوا دم واپس آگیا چند دن میں بادشاہ کو صحت ہوگئی۔ غسل صحت کے دن حکومت کے تمام قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ وہ نوجوان بھی قید سے چھوٹ گیا ـــ !

نوجوان نے قید سے چھٹنے کے بعد شاہی بحریہ میں نوکری کرلی، وہ ایک ملّاح کا

بیٹا تھا۔ اور سمندر کی موجوں کی گود میں اُس نے پرورش پائی تھی۔ نوجوان بڑا ہی مشاق اور فرض شناس ملاح تھا۔ عین منجدھار میں بھی بادبان کو ہوا کے رُخ پر روکے رکھنے کا اس میں حوصلہ بھی تھا اور سمجھ بھی تھی۔ شاہزادی ایک دن سمندر کی سیر کرنے کے لئے شاہی کشتی میں روانہ ہوئی۔ نوجوان کشتی کا ناخدا تھا۔ سمندر میں طوفان آیا کشتی ڈگمگ ڈگمگ کرنے لگی۔ نوجوان بادبان کو سنبھال رہا تھا کہ شاہزادی اُس کے پاس پہنچی، وہ سہمی ہوئی تھی۔ خوف اور بدحواسی کے آثار اسکے چہرے سے نمایاں تھے۔

—— آپ خدا کے لئے مجھ سے دُور ہی رہیئے ورنہ مجھے پھر دیس سے نکال دیا جائے گا —— نوجوان نے شاہزادی سے کہا۔

—— ارے تم ہو ——! خوف نہ کرو اب کوئی تمہارے ساتھ بدسلوکی نہیں کرسکتا —— شاہزادی نے جواب دیتے ہوئے بادبان کا ایک حصہ تھام لیا طوفان زور پر تھا پانی کی نہایت ہی تیز موج آئی۔ کشتی اوپر نیچے ہونے لگی شاہزادی بیہوش ہوکر گری۔ نوجوان نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا، تھوڑی دیر میں طوفان تھم گیا، شاہزادی نے آنکھیں کھولیں وہ مسکرائی نوجوان اسکے قریب کھڑا تھا!

یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا کہ رُوم کے سب سے بڑے شاعر نے ایک نظم کہی جس کا عنوان تھا۔ محبّت نے طوفان کو ٹھیرا دیا ——!

بہن بھائی

اکرم اپنی بیٹھک میں اخبار پڑھ رہا تھا، تازہ اخبار اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اخبار پڑھتے ہوئے وہ کہتا جاتا تھا، یہ ظالم جنگ نہ جانے کب ختم ہوگی، تمام دُنیا میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ فقیر سے لیکر بادشاہ تک سبھی پریشان اور مضطرب ہیں انسانی خون اتنا ارزاں تو شاید کبھی نہیں ہوا ـــــــ اُس نے قہقہہ لگایا کمرے میں گونج پیدا ہوگئی وہ پھر بولا اس آتشیں اور خونریز جنگ سے اتنا فائدہ تو ضرور ہوگا کہ مغربی تہذیب کا نام ونشان مِٹ جائے گا اور دنیا کو از سرِ نو غور کرنا پڑیگا کہ آسودگیٔ حیات، تنظیمِ اقوام اور امن و آسائش کے لئے کِس نظام کو قبول کیا جائے۔

اُس نے اخبار کے اداریہ (لیڈر) کو پڑھا اور سگرٹ سلگاتے ہوئے کہنے لگا ـــــــ! گویا کہ دنیا میں اب تک جو کچھ ہوا وہ سب کچھ اس اخبار کے فاضِل ایڈیٹر سے مشورہ کرنے کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ دنیا کے ہر حادثہ پر ایڈیٹر صاحب کی نظر ہے اور مستقبل کے تمام واقعات ان کو معلوم ہیں ـــــــ سُبحان اللہ ـــــــ! چشمِ بد دور ـــــــ! لوگوں کو اپنے متعلق کیا کیا غلط فہمیاں ہیں ـــــــ!

ایک خبر کی سُرخی تھی :ـ

گرلس کالج کا ایک شرمناک واقعہ۔

اکرم نے خبر کو پڑھا اور پنسل گھماتے ہوئے کہنے لگا جو کچھ ہوا اسے ہونا ہی چاہیئے تھا جس بورڈنگ میں کنواری لڑکیاں ایک جگہ رہتی ہوں اور در و دیوار پر مغربی تہذیب چھائی ہوئی ہو وہاں کوئی "شرمناک واقعہ" اگر ظہور میں نہ آتا تو حیرت کی بات تھی۔ "چراغِ خانہ" کو جب "شمعِ انجمن" بنانے کی کوشش کی جائے گی۔ بے اعتدالیوں سے بچنا ممکن نہیں۔ قدرت نے عورت اور مرد کی ذمّہ داری اور وظیفۂ حیات میں حدِ فاصل قائم کر دی ہے۔ مرد معیشت کا بادشاہ ہے اور عورت تدبیرِ منزل کی ملکہ! اس ملکہ کو جب بھی معیشت کے بازار میں لایا جائے گا نظامِ زندگی میں ابتری پیدا ہو جائے گی۔!

ارے —— ! یہ کوئی نیا کھیل آگیا —— اکرم اخبار میں سینما کا ایک اشتہار پڑھتے ہوئے بولا۔ اُس نے اشتہار کو خوب غور سے پڑھا اور ہنس کر کہنے لگا۔ ہماری نظر سے تو آج تک سینما کا کوئی ایسا اشتہار نظر سے نہیں گزرا جس میں کسی ایکٹریس کو کم سے کم پری چہرہ، حُسنِ مجسّم، اور حور طلعت نہ ظاہر کیا گیا ہو کیا دنیا کا سارا حسن نگارخانوں میں کھنچکر آگیا ہے اور ان ایکٹریسوں میں کوئی اللہ کی بندی قلوپطرہ اور شکنتلا سے کم حسین ہوتی ہی نہیں —— دھوکا، فریب تجارت —— ! انسانوں کے ہوسناک جذبات کی کمزوری سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے .... اور اس تمام فریب و ریاکاری کا نام ہے "آرٹ" —— !

اکرم نے اخبار بند کر کے رکھا ہی تھا کہ دروازے پر کسی باہر سے آنے والی کی پہچل سُنائی دی، اکرم سمجھا کہ شاید اُس کا کوئی دوست ملنے کے لئے آرہا ہے آنیوالے

کے قدموں کی چاپ دروازے پر آکر رُک گئی اور دروازے کی چلمن کو تھوڑی سی جنبش ہوئی جیسے کوئی ناواقف اور اجنبی آدمی اندر آنا چاہتا ہے۔

——آپ کون ہیں ——! اندر آئیے صاحب!...... اکرم نے کہا اور ایک سال خوردہ عورت دروازے کے اندر داخل ہو گئی ——! عورت کی عمر ۵۰ سال سے کچھ اوپر ہی ہوگی، پچکے ہوئے گال، اُترا ہوا چہرہ، ہاتھوں پر جھرّیاں، دوپٹہ ذرا اُجلا مگر کُرتہ اور پاجامہ بہت زیادہ میلا، وہ چہرے سے کسی کی مُلازمہ معلوم ہوتی تھی۔!

تم کیا چاہتی ہو؟ مجھ سے کوئی کام ہے کیا؟——اکرم نے قدرے متحیّر ہو کر کہا۔

جی ہاں! آپ کو ایک تکلیف دینی ہے ——عورت نے جواب دیا۔

کہو تو سہی..... کیا کام ہے مجھ سے ——اکرم دیا سلائی کی ڈبیہ اُٹھاتے ہوئے بولا

سامنے کی گلی میں ایک بی بی رہتی ہیں وہ آپ سے ایک خط پڑھوانا چاہتی ہیں آپ میرے ساتھ وہاں تک چلے چلیں تو بڑی مہربانی ہوگی ——بڑھیا نے اس قدر لجاجت آمیز انداز میں کہا کہ اکرم اس کے ساتھ اُٹھ کر چل دیا——! بڑھیا آگے آگے تھی اور اکرم اُس کے پیچھے چل رہا تھا۔ گلی کے آخری سرے پر بڑھیا نے ایک مکان پر دستک دی، دروازہ کھلا اور بڑھیا نے مکان میں قدم رکھتے ہی کہا:-

وہ آگئے، باہر کھڑے ہیں——"

بڑھیا اندر چلی گئی اور چند منٹ کے بعد مکان سے باہر آکر اکرم سے بولی:-

"میاں! اندر تشریف لائیے......"

اس پر اکرم نے کہا:-

اندر جانیکی کیا ضرورت ہے! خط میں یہیں کھڑے پڑھ دوں گا......!

بڑھیا نے جواب دیا:-

میاں! اندر پردے کا انتظام کرا دیا گیا ہے، وہاں چلیے! ممکن ہے کہ خط پڑھنے کے بعد اُس کا جواب بھی آپ کو لکھنا پڑے ۔۔۔۔!

اکرم مکان کے اندر داخل ہوا اور چھوٹے سے صحن سے گذر کر دالان میں پہونچا جہاں تخت پر ملگجی سی چاندنی بچھی ہوئی تھی اور دیوار کے سہارے ایک گاؤتکیہ رکھا تھا۔ گاؤتکیہ کا غلاف چادر نما سا تھا جیسے کہ کسی نے لحاف اور توشک کو چادر میں لپیٹ کر گاؤتکیہ بنا دیا ہے۔ دالان کے ایک دروازے کے کُنڈے میں طوطے کا پنجرا لٹکا ہوا تھا، دالان کے قریب ہی صحنچی پر ٹوٹی ہوئی اینٹیں بچھی ہوئی تھیں جن پر پانی کے گھڑے رکھے تھے۔ دالان کی دیواروں پر کتبے آویزاں تھے ان کتبوں کے پڑھنے سے اس بات کا اندازہ ہوتا تھا کہ صاحبِ مکان کا ذوقِ شعری بہت ہی پست ہے۔ کتبوں پر اس قسم کے اشعار:-

تجھے حکم ہے اکبری سروری ۔۔۔ مری بار کیوں دیر اتنی کری

اور

کوئی دم میں دم جب یہ جاتا رہے گا ۔۔۔ تو ہمدم بتا کس سے ناتا رہے گا

لکھے ہوئے تھے۔ دو تین کتبوں پر آئینے لگے تھے مگر یہ بھی جگہ جگہ سے شکستہ تھے دیوار گیری کے قریب کسی کمپنی کے اشتہار کا کیلنڈر بھی آویزاں تھا۔ اس کیلنڈر کی صُورت یہ تھی کہ مہینہ تو تھا جولائی کا اور کیلنڈر کا صفحہ اپریل کے مہینہ کی تاریخیں بتا رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ گھر والوں نے اپریل کے بعد کیلنڈر کی تاریخیں بدلنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی ۔۔۔۔!

اکرم چاندنی پر بیٹھ گیا، اندر سے پانوں کی تھالی آئی۔

میں تو پان نہیں کھاتا .... اکرم نے آہستگی کے ساتھ کہا۔

اندر سے اشارہ ہوا، وہی بوڑھی عورت (ماما) جو اکرم کو یہاں بلا کر لائی تھی اندر گئی کچھ سرگوشیاں ہوئیں اور ماما باہر آکر بولی:۔

آپ پان نہیں کھاتے تو الائچی کھا لیجئے۔

اکرم نے تھالی سے ایک الائچی اٹھالی، معلوم ہوتا تھا اکرم کے اس کہنے پر کہ میں پان نہیں کھاتا ہوں، ماما کو اندر بلا کر کہلوایا گیا کہ پان نہیں تو الائچی کھا لیجئے ماما اندر سے لفافہ لیکر آئی، اکرم نے لفافہ سے پرچہ نکال کر پڑھنا شروع کیا، خط کا مضمون بہت مختصر تھا مگر لکھنے والا بہت زیادہ بدخط اور کم سواد تھا۔ اکرم کو کئی جگہ رکنا پڑا، خط پڑھنے میں اکرم کے رُکنے اور اٹکنے پر ماما قدرے مسکرائی کہ میاں! کچھ زیادہ لکھے پڑھے معلوم نہیں ہوتے، اب تک پردے کے اندر سرگوشیاں ہو رہی تھیں، اکرم کے خط پڑھنے کے دوران میں اندر سے بھنچی ہوئی سی آواز آئی:۔

اس سے پہلے آپ نے کیا پڑھا کہ یہاں بہت پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔!

اکرم نے جملہ کو پھر دُہرایا۔ اکرم نے خط پڑھنے کے بعد اُٹھنا چاہا کہ پھر ماما نے کہا:۔

میاں! اتنی تکلیف کی ہے تو ذرا اس خط کا جواب بھی لکھ دیجئے۔!

اکرم تخت پر اٹھ کر بیٹھ گیا، ماما نے دوات قلم، خط کا کاغذ اور لفافہ لا کر رکھ دیا، اکرم نے کاغذ اُٹھایا اور خط لکھنے کے لئے تیار ہو گیا

ہاں! تو اس خط کے جواب میں کیا لکھا جائے ——— اکرم نے دوات کی سیاہی قلم میں لیتے ہوئے کہا۔

ماما نے جواب دیا کہ میں ابھی آتی ہوں آپ ذرا ٹھیرئیے ماما اندر پردے میں گئی بہت دیر سرگوشیاں ہوتی رہیں پھر وہ دالان میں آئی اور بولی :-

میاں ! دُعا سلام کے بعد لکھئے کہ یہاں خدا کے فضل سے ہر طرح خیریت ہے اور تمھاری خیریت اللہ میاں سے نیک چاہتے ہیں، تمھارا خط ملا اس میں جو کچھ حال لکھا تھا وہ ہمیں معلوم ہوا، تمہارے یہ لکھنے سے کہ پُونا میں جنگ کی خبروں سے پریشانی پھیلی ہوئی ہے۔ ہمیں بہت فکر ہوئی، زمانہ بہت نازک ہے منٹ منٹ پر دنیا کا رنگ بدل رہا ہے نہ جانے کل کیا ہو اس لئے تم اس خط کے دیکھتے ہی چلے آؤ۔ روٹی وہاں کھاؤ تو پانی یہاں آکر پیو، سب لوگ تمھارے انتظار میں ہیں کتنا بھی ضروری کام کیوں نہ ہو اُسے چھوڑ کر چلے آؤ۔ روپیہ پیسہ کا خیال نہ کرو، جان ہے تو جہان ہے — !

اور ہاں ! تم نے جو روپیہ بھیجا تھا وہ سب ختم ہو گیا (اس مقام پر پردے سے آواز آئی — نہیں ! یہ لکھواؤ کہ بس دو چار روپے باقی رہ گئے ہیں) اور قانون گو صاحب نے دو مہینہ سے مکان کا کرایہ نہیں دیا، تم آجاؤ گے تو معاملہ کا تصفیہ ہو گا۔ ہماری بات کی تو قانون گو صاحب پرواہی نہیں کرتے — ! مکان آتے وقت تین دوپٹوں کے لئے ڈھاکہ پاٹن کی ململ، کُرتوں کے لئے اچھا سا کپڑا اور پاجاموں کے واسطے نٹ کا لٹھا ضرور لیتے آؤ (یہاں پھر اندر سے آواز آئی اور یہ لکھواؤ کہ :-
حیدرآبادی کام کی چوڑیاں بھی ضرور لیتے آئیں ......!)

اور ہاں ! میاں یہ بھی ضرور لکھیئے کہ ایک طوطا اُڑ گیا، دوسرا بیمار ہے، طوطے کا پنجرہ ٹوٹ گیا ہے۔ گھر ہی میں پنجرے کو سرکنڈے کی تیلیوں سے ٹھیک کر دیا گیا ہے۔

تم آؤ گے تو پنجرہ بھی بنجائے گا (اندر سے پھر کہا گیا کہ اتنا اور لکھوا دو کہ تمھاری خالہ کا بڑا لڑکا اپنے گھر سے روپیہ لیکر کہیں چلا گیا سب لوگ حیران پریشان ہیں)

ماما کی راگ مالا کسی طرح ختم ہی نہ ہوتی تھی اکرم نے اس پر کہا:-

صاحب! خط میں اتنی تمام باتیں نہیں لکھی جائیں گی، اس کے لئے تو دس بیس ورق بھی کافی نہ ہوں گے۔ اکرم کے اس کہنے پر اندر سے کہا گیا:-

یہ بڑی بی تو بانونی ہیں ذراسی بات کو خوب پھیلا کر بیان کرتی ہیں۔ آپکو ہمارا مطلب تو معلوم ہو گیا ہماری باتوں کو اپنے لفظوں میں لکھ دیجئے۔

اکرم نے خط لکھا اور پڑھکر سنایا، پردہ نشین خاتون بولی:-

بہت ٹھیک لکھا آپ نے! مگر اتنی سی بات اور بڑھا دیجیے کہ اُن کے صندوق میں میری کنجیوں کا گچھا رہ گیا تھا اُسے ضرور لیتے آئیں۔!

اکرم نے اس جملہ کو بعد میں بڑھا دیا اور لفافہ پر پتہ لکھتے ہوئے بولا:-

خط میں جگہ کا نام اور محلہ کا نام تو پڑھا جاتا ہے مگر خط بھیجنے والے کا نام اس قدر شکستہ خط میں لکھا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ نہ جانے کیا نام لکھا ہے۔

اکرم کے دریافت کرنے پر خاموشی چھا گئی —!

میں آپ کے شوہر کا نام پوچھ رہا ہوں، اُن کا نام بتائیے —!

اس کا بھی کوئی جواب نہیں ملا، اکرم نے قدرے جھنجلا کر پھر پوچھا تو ماما بولی:-

ہمارے سرکار کو تو سب قاضی جی کہکر پکارتے ہیں آپ یہی لکھدیجیے۔

اکرم نے قلم کی سیاہی جھٹکتے ہوئے کہا:-

ارے تمھارے قاضی جی کو پونا جیسے غدار شہر میں کون جانتا ہے ! اگر میں نے لفافہ کے پتہ میں "قاضی جی" لکھ دیا تو یہ خط ان کو قیامت تک نہیں ملے گا۔! نام بتانے میں آخر تامّل کیوں ہے......!

اِس پر اندر سے ماما کو بُلایا گیا اور ماما نے اندر ہی سے کہا کہ ان کا نام عبدالرشید ہے۔ اکرم نے لفافہ پر پتہ لکھ کر لفافہ تخت پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بی بی ! آپ کو سلام کہہ رہی ہیں اور شکریہ ادا کر رہی ہیں..... ماما نے کہا۔

میرا بھی سلام کہیئے اور اس میں شکریہ ادا کرنے کی کیا بات تھی ..... اکرم جواب دیتے ہوئے باہر آگیا اور اُس دن کے بعد سے ماما جب بھی اکرم کو بُلانے کیلئے آئی وہ اس کے مکان میں گیا اور خط سُنا کر یا جواب لکھ کر چلا آیا..... ! بعض دن اکرم ایک ایک گھنٹے اس مکان میں رہا اور اب پردہ نشین خاتون اُس سے بات چیت کرنے میں کوئی تکلف محسوس نہیں کرتی تھی۔ مگر اس شریف نوجوان نے کبھی بھولے سے بھی چلمن کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اکرم اس مکان میں نگاہیں نیچی کئے بیٹھا رہتا۔ گفتگو صرف خط و کتابت کی حد تک محدود رہتی۔ ادھر خط و کتابت کا کام ختم ہوا اور اکرم وہاں سے چلا آیا۔ بات یہ تھی کہ نہ تو عورت کی طرف سے بے تکلف ہونے یا ربط ضبط بڑھانے کی کوشش کی گئی اور نہ اکرم نے کوئی اقدام کیا۔ دونوں کے دل میں کوئی ذرا سی بھی بات پیدا نہیں ہوئی تھی۔ طبیعت بالکل صاف اور دل قطعاً پاک تھے جب دِل میں چور ہوتا ہے یا دلچسپی محسوس کی جاتی ہے تو طرفین میں سے ایک فریق بات میں بات نکالکر زیادہ سے زیادہ دیر تک ہم نشینی اور گفتگو کے موقع پیدا کرتا ہے۔ یہی دلچسپی بڑھتے بڑھتے دُور پہونچ جاتی ہے۔ بڑی سے بڑی ہوسناکی کی ابتدا ایک مسکراہٹ

پوچھتے ہوئے فقرے ہی سے ہوتی ہے - پہنچا پکڑنے کے لیے پہلے انگلی ہی کو چھوا
جاتا ہے - یہاں دونوں طرف اس قسم کے چٹخاروں کا احساس تک نہ تھا - اُس
پردہ نشین عورت کی ماما اگر ایک مہینے تک نہ آئی تو اکرم نے ذرا سی بھی بے چینی
محسوس نہیں کی اور اگر ماما کے بُلانے پر ہفتہ میں دو دن وہاں جانا پڑا تو اکرم کو کوئی
خوشی نہیں ہوئی -

ایک دن ماما کے بُلانے پر اکرم وہاں گیا اُس نے خط پڑھا خط میں لکھا تھا
کہ میری کلائی کی گھڑی جو ٹین کے بکس میں رکھی ہے فوراً پارسل کے ذریعہ بھیجدو - !

کیا گھڑی منگائی ہے انھوں نے ——— پردہ نشین عورت نے کہا -

جی ہاں ——— اکرم نے جواب دیا -

تو اُن کے پاس یہاں سے گھڑی کس طرح بھیجی جائے گی - ! عورت نے دریافت کیا

پارسل کے ذریعہ ——— اکرم نے جواب دیا -

پارسل..... پارسل ——— عورت نے مستفسرانہ انداز میں جواب دیا -

آپ تو غدر کے زمانہ کی بڑی بوڑھیوں جیسی باتیں کرتی ہیں - دُنیا کی کسی بات
کی آپ کو خبر نہیں ——— ! آپ کو اگر مجھ پر اعتبار ہو تو گھڑی مجھے دیجیے میں اسے پُونا
بھیجدوں گا - اور ہاں ! اسکے بھیجنے پر کچھ خرچ بھی ہو گا ——— اکرم بولا -

گھڑی بھیجنے میں خرچ کتنا ہو گا ——— عورت نے دریافت کیا -

زیادہ سے زیادہ بارہ آنہ ! آپ ایک روپیہ اور گھڑی ماما کے ہاتھ میرے
یہاں بھجوا دیجیے - پارسل روانہ کرنے کے بعد جو کچھ بچیگا، میں آپ کے یہاں بھجوا دوں گا
——— اکرم جواب دیتے ہوئے واپس چلا گیا -

اکرم زنانے میں کھانا کھا رہا تھا کہ ماما کلائی کی گھڑی اور ایک روپیہ لیکر اندر پہنچی۔ اکرم کی بیوی نے ماما کو ذرا گھور کر دیکھا اور بولی :۔

کہاں سے آئی ہو تم۔

اِس پر ماما نے کہا :۔

بی بی نے مجھے میاں (اکرم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے پاس بھیجا ہے۔!

اکرم کی بیوی نے جھنجلا کر جواب دیا :۔

کیسی بی بی! کہاں کی بی بی ! اور پھر میاں کے پاس اُن بی بی نے تمھیں بھیجا ہے، خوب ! یہ کیا !

اکرم نے اس پر بیوی کی بات کاٹتے ہوئے کہا :۔

ہاں! ہاں! یہ بڑی بی میرے پاس آئی ہیں .... ! (ماما کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) لاؤ کلائی کی گھڑی اور روپیہ لاؤ۔ شام کو دن چھپنے سے پہلے تم میرے پاس آنا، میں تم کو ڈاک خانہ کی رسید اور بچے ہوئے پیسے دیدوں گا۔

اکرم کی بیوی حیرت کیساتھ اکرم کا مُنہ دیکھنے لگی کہ آج یہ کیا گل کھِل رہا ہے، ماما گھڑی اور روپیہ دے کر چلی گئی، اکرم نے بیوی کو گھڑی پکڑاتے ہوئے کہا :۔

ذرا اس گھڑی کا پارسل تو بنا دو !

اِس پر اکرم کی بیوی مُنہ سکیڑتے ہوئے بولی :۔

کہاں جائیگا اس گھڑی کا پارسل ..... ! اور بھیجنے والا کون ہے۔ !

اکرم نے فیرنی کی پیالی اُٹھاتے ہوئے جواب دیا :۔

یہ ہمارے محلے کے قریب جو قاضیوں کی گلی ہے اُس کے آخری سرے پر

ایک بی بی رہتی ہیں اُن کے شوہر کی پونا میں لکڑی کی ٹال ہے مجھے وہ کبھی کبھار خط پڑھنے کے لئے بلا لیتی ہیں ..... بیوی - ! اس زمانہ میں ایسی سیدھی سادھی اور بھولی عورت میں نے تو دیکھی نہیں - ! اجی ! وہ یہ تک نہیں جانتی کہ ڈاک خانہ کا پارسل کیا بلا ہے - ! اُس کے شوہر نے کلائی کی گھڑی پارسل کے ذریعہ منگوائی ہے تم ذرا پارسل سی دو میں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد ڈاک خانہ جا کر پارسل کرا آؤں گا - !

اکرم کی بیوی نے گھڑی کا پارسل سینے کو تو سی دیا مگر پارسل کے ہر ٹانکے پر وہ ہلکی سی خلش محسوس کرتی تھی - وہ اپنے شوہر سے بدگمان تو نہ تھی - لیکن اس بالکل نیے واقعہ نے بدگمانی کے آثار پیدا کر دئے تھے وہ سوچنے لگی کہ اُس عورت نے سارے محلے کے لوگوں کو چھوڑ کر اکرم ہی کو آخر کیوں منتخب کیا اور اکرم کو اسکے ساتھ اتنی ہمدردی اور دلچسپی کیوں پیدا ہو گئی کہ وہ اس کا پارسل لیکر ڈاک خانہ جائے گا - جنگ کے زمانہ میں ایک پارسل اور منی آرڈر کے لئے ڈاک خانہ کی کھڑکی پر دو دو گھنٹہ کھڑا رہنا پڑتا ہے - بات آئی گئی ہو گئی، مگر اکرم کی بیوی شوہر سے قدرے کھٹکنے لگی اور یہ واقعہ اس کے دل پر نقش ہو گیا اگر وہ اپنے شوہر سے اس بدگمانی کا اظہار کر دیتی تو معاملہ صاف ہو سکتا تھا لیکن بدگمانی کا یہ خاصہ ہے کہ فریقِ ثانی کو ہمیشہ بےخبری اور تاریکی کے عالم میں رکھا جاتا ہے - !

اکرم کے چچا نے جنگل میں لکڑی کا ٹھیکہ لیا تھا، اکرم کا بھی اُس میں کچھ حصّہ تھا، لکڑی جنگل میں کاٹی جا رہی تھی، چچا کا خط آنے پر اکرم وہاں چلا گیا، کام کی کثرت تھی - کام کی دیکھ بھال کے لئے اعتماد کے آدمی کی ضرورت تھی اور اکرم سے زیادہ قابلِ اعتماد آدمی اور کون ہو سکتا تھا، اکرم کو ایک ماہ کے قریب جنگل میں رُکنا پڑا -

جنگل کی زندگی کو اکرم نے بہت پسند کیا، ہرے بھرے درخت، دلچسپ مناظر، سیر و شکار اور وہ بھی اِس کثرت کے ساتھ کہ تیتر اور بٹیر کھاتے کھاتے اکرم اُکتا گیا تھا۔ بندوق کا فایر کیا اور ایک دو ہرن شکار ہو گئے۔ اکرم کام سے واپس آیا کہ ہرن کے کباب دسترخوان پر موجُود تھے۔ جنگل کے لوگوں کی باتوں میں اکرم غیر معمولی دلچسپی لیتا وہ لوگ اکرم کو نصیحت کرتے۔

سرکار ـــ! جنگل میں شیر نظر آجائے تو اس سے کبھی آنکھیں نہ ملائیے نگاہیں نیچی کر لیجیے۔ اور شیر کا آگے سے کبھی راستہ نہ کاٹیے ـــ! نہیں تو قیامت ہی آجائیگی شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ حضور! اور کوئی بادشاہ یہ بات گوارا نہیں کر سکتا کہ معمولی لوگ اس کے سامنے سے گذرتے ہوئے چلے جائیں۔ اور ہاں سرکار! شیر کا سامنا ہی ہو جائے تو نیچی نگاہیں کر کے کہہ دیجیے ـــ او جنگل کے راجہ! تو اپنے راستہ کو جا، ہم اپنے راستہ کو جاتے ہیں ـــ! یہ بات سُنکر پھر شیر بولے گا نہیں! اور حضور! جنگلی سور سے بچے رہیئے یہ شیر سے زیادہ کمینہ اور خطرناک ہے۔ اِس موذی کا اتفاق سے سامنا ہو جائے تو بھاگئے گا نہیں بلکہ ہمت کیساتھ کھڑے رہیئے وہ آپ کی طرف تیر کی طرح سیدھا آئیگا۔ جب وہ قریب آئے تو اسکے راستہ سے چند قدم ہٹ جائیے وہ اپنے زور میں آگے کو بھاگا چلا جائے گا ـــ!

اکرم جنگلی آدمیوں کی باتوں پر مُسکرا مُسکرا کر کہتا ہاں! ہاں! بھئی تمھاری ایک ایک بات پر عمل کیا جائے گا۔ میں تمھارے کہنے سے باہر نہیں ہو سکتا ـــ!

اکرم کی بیوی کے دل میں ایک خلش سی پیدا ہو گئی تھی۔ اکرم کے جانے کے چند دن بعد اُسنے اُس عورت کا پتہ لگایا جس کے بارے میں اکرم نے کہا تھا کہ وہ

اس کے یہاں خط لکھنے کے لئے جایا کرتا ہے۔ اکرم کی بیوی کو اُس عورت کی ماما دکھ چکی تھی اپنی ملازمہ کے ہاتھ اکرم کی بیوی نے اُس عورت کی ماما کو بلایا اور ماما کے آنے پر اُس سے کہلا بھیجا اپنی بیگم صاحبہ سے کہنا کہ میں کل شام کو اُن سے ملنے کے لئے آؤں گی، دوسرے دن وہ ڈولی میں سوار ہو کر اُس عورت کے یہاں پہنچی۔!

اکرم کی بیوی اور اُس پردہ نشین عورت (قاضی جی کی بیوی) میں صاحب سلامت ہونے کے بعد بات چیت ہونے لگی۔ اکرم کی بیوی اُس مکان کے در و دیوار کو بدگمانی اور رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، قاضی جی کی بیوی کو دیکھتے ہی اکرم کی بیوی کا ماتھا ٹھنکا کہ کچھ نہ کچھ دال میں کالا ضرور ہے۔ بات یہ تھی کہ قاضی جی کی بیوی اکرم کی بیوی سے بہت زیادہ حسین تھی۔ گداز جسم تناسب اعضا، سرخ و سپید رنگ قاضی جی کی بیوی سر سے پیر تک چھبن ہی چھبن تھی۔ قاضی جی کی بیوی باتوں ہی باتوں میں بولی:۔

"آپ کے شوہر بڑے ہی نیک اور بھلے آدمی ہیں۔ بیچارے اپنا کام ہرج کر کے ہمارے یہاں آ کر خط لکھ جاتے ہیں۔! ان کی سادہ مزاجی کا یہ عالم ہے کہ پان تک نہیں کھاتے۔ بعض مرتبہ تو ہفتے میں دو دو مرتبہ ان کو بُلانا پڑا ہی مگر انھوں نے کبھی انکار نہیں کیا، ایسے ہمدرد اور نیک مزاج آدمی اس دُنیا میں کہاں —!

اکرم کی بیوی کو قاضی جی کی بیوی کا ایک ایک لفظ ناگوار گذر رہا تھا، وہ محسوس کر رہی تھی کہ یہ اُس کے شوہر کی تعریف نہیں ہو رہی ہی بلکہ اس کی غیرت کو گالیاں دی جا رہی ہیں اور اس کی حمیت کا مُنھ چڑایا جا رہا ہے۔ بدگمانی رقابت میں تبدیل ہو چکی تھی۔

گھر آکر وہ پہروں سوچتی رہی۔ بدگمانی نے ایک ایک بات کو دفتر بنا دیا، وہ کہنے لگی :-

"وہ تو کئی مہینے سے گھر میں بہت کم رہتے ہیں، جنگل جاتے ہیں تو واپسی کا نام نہیں لیتے۔! یقیناً ان کی دل چسپی کہیں اور ہو گئی ہو۔ ابھی کچھ دن پہلے تک اُن کا یہ عالم تھا کہ ذرا میرے کپڑے پر شکن پڑ گئی تو کپڑے بدلوا کر چھوڑے اور اب میں کتنے ہی میلے کپڑے کیوں نہ پہنے رہوں وہ ٹوکتے تک نہیں۔!

ایک دن وہ انگریزی اخبار میں تصویر دیکھتے ہوئے کہہ بھی رہے تھے...... ! یہ میاں بیوی خوب ہیں۔! دونوں کے دونوں خوبصورت! ایسی ہی جوڑی ہونی چاہیئے۔! یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی غیر مطمئن اور ناخوش نہیں رہ سکتے"

اکرم کے جنگل چلے جانے کے بعد قاضی جی کی بیوی کو بڑی دقّت پیش آئی، قاضی جی کے کئی کئی خطوں کا جواب نہیں دیا گیا، ماما اکرم کے یہاں جب بھی آئی تو یہی معلوم ہوا کہ اکرم ابھی چند دن تک اور باہر رہے گا۔ قاضیوں کی گلی کے قریب مسجد تھی اور مسجد سے ملا ہوا میونسپلٹی کے سکتّر کا مکان تھا۔ سکتر کا چھوٹا بھائی اشفاق مردانے نشست میں دوستوں کے ساتھ شطرنج اور چوسر کھیلتا نظر آتا تھا۔ اشفاق کی عمر پچیس چھبیس سال کے لگ بھگ تھی۔ انٹرنس کے امتحان میں وہ مسلسل چار سال ناکام رہا۔ اب وہ منشی فاضل کے لئے تیاری کر رہا تھا، لیکن اُس کی پڑھائی کا یہ عالم تھا کہ جب تک بڑے بھائی گھر پر رہے کتابیں اُلٹتا رہا اور اُن کے جاتے ہی دوست احباب

آ گئے۔ شعر شاعری ہوئی، فلمی گیت گائے گئے اور شطرنج کی بساط جو بچھی ہے تو شام تک "پیدل سے شہ مات" "ارے فرزیں پر زد پڑی" "ناصر! گھوڑے کو بچاؤ" کی آوازیں آتی رہتیں۔

اشفاق کے دوست بدکردار نہیں تو آوارہ مزاج ضرور تھے اور آوارہ مزاجی درحقیقت بدکرداری کا پہلا زینہ ہے۔ یہ لوگ گھنٹوں اشفاق کے یہاں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا ذکر کرتے۔ ان میں سے بہت سوں کو تو ایکٹرسوں کے خاندانی نسب نامے اور گھریلو حالات اس تفصیل کے ساتھ معلوم تھے کہ تاریخ کے کسی عالم کو بھی دنیا کی کسی بڑے سے بڑی شخصیت کے حالات و واقعات کا اسقدر تفصیلی علم نہ ہوگا۔ اشفاق کی جوانی آوارگی کے ماحول میں بسر ہو رہی تھی۔ جوانی ایک تو یُوں ہی اندھی اور بہری ہوتی ہے اور اگر کہیں خراب ماحول مل جائے پھر تو یہ دیوانی بھی ہو جاتی ہے۔

قاضی جی کی ملازمہ کسی لکھے پڑھے شخص کی تلاش میں تھی، اشفاق کو اُس نے کئی مرتبہ محلّے کی گلی سے آتے جاتے دیکھا تھا، سکتّر صاحب سے محلہ کے قریب قریب تمام لوگ واقف تھے۔ ماما نے قاضی جی کی بیوی سے کہا کہ اکرم صاحب تو باہر گئے ہوئے ہیں آپ کہیں تو سکتّر صاحب کے بھائی کو بُلا لاؤں۔ قاضی جی کی بیوی کو تو ایک لکھے پڑھے آدمی کی ضرورت تھی۔ اُس نے ماما سے کہا کہ جب اکرم یہاں نہیں ہیں اور نہ قریب میں اُن کے یہاں آنے کی امید ہے تو سکتّر صاحب کے بھائی کو ہی بُلا کر لے آؤ۔

اشفاق اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سگرٹ پی رہا تھا کہ ماما کمرے کے دروازے پر

جا کر کھڑی ہو گئی۔

کیوں! کیسے آئیں۔؟ سکتر صاحب تو دفتر چلے گئے ——— اشفاق نے ملازمہ سے کہا۔

سکتر صاحب سے نہیں آپ سے کام ہے ——— ماما نے جواب دیا۔

مجھ سے کام ہے..... ! خوب ! لیکن میں بھائی جان سے کسی کی سفارش وفارش نہیں کیا کرتا ——— اشفاق بولا

میری بی بی یہیں قریب ہی رہتی ہیں وہ آپ سے خطوں کا جواب لکھوانا چاہتی ہیں۔ آپ اگر تکلیف فرمائیں تو بڑی مہربانی ہو گی آپ کی ——— ماما نے بڑی عاجزی کے ساتھ کہا۔

میں ابھی چلتا ہوں، تم یہاں تخت پر بیٹھ جاؤ ——— اشفاق کہتے ہوئے بہت خوش خوش اندر گیا۔ اُس کا خیال نہیں یقین تھا کہ کسی عورت نے خط لکھوانے کے پردے میں محبت کا پیام بھیجا ہے۔ ہوس کاری اور آوارگی کو اس قسم کی غلط فہمیوں میں لُطف آتا ہے۔ اشفاق نے اندر جا کر جلدی جلدی ڈاڑھی صاف کی صابون سے مُنھ خوب مل ملکر دھویا۔ رخساروں پر کریم لگایا اور خوب بن ٹھن کر ماما کے ساتھ روانہ ہُوا۔ آئینہ میں چہرہ دیکھتے وقت وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ مجھ جیسے سجیلے نوجوان کی طرف رنگین مزاج عورتوں کو متوجہ ہونا ہی چاہیئے۔

تمھاری بی بی کہاں خط لکھوانا چاہتی ہیں ——— اشفاق نے ماما سے دریافت کیا

اُن کے میاں پونا میں ہیں اُنھی کے نام خط لکھوانا ہے ——— ماما نے جواب دیا۔

تو تمھاری بی بی یہاں اکیلی رہتی ہیں ——— اشفاق نے ٹوہ لینے کیلئے دریافت کیا۔

جی ہاں! وہ یہاں اکیلی رہتی ہیں۔ بس ایک وہ ہیں اور ایک میں ——— ماما نے جواب دیا اور اتنے میں قاضی جی کی بیوی کا مکان آگیا۔ ماما نے مکان میں گھستے ہوئے کہا کہ آپ ٹھیر یئے میں ابھی آپ کو بلاتی ہوں۔ اشفاق کی خوشی کا کیا پوچھنا وہ ماما کی زبانی سن چکا تھا کہ عورت کے شوہر پردیس میں ہیں اور وہ اکیلی رہتی ہے اسی عورت نے اشفاق کو بلایا تھا۔ اشفاق کی نگاہ میں کسی عورت کا شدید سے شدید ضرورت کے وقت بھی کسی مرد سے امداد طلب کرنا یا دستگیری کی توقع رکھنا ہوسناک اقدام کی دلیل تھا۔

ماما نے باہر آکر کہا کہ اندر آئیے۔ اشفاق اندر پہونچا۔ کسی کے کہے بغیر بلا تکلف تخت پر بیٹھ گیا۔ ماما نے اندر سے خط لاکر دیئے کہ انھیں پڑھ دیجیے۔ اشفاق نے خط سنانا شروع کئے اور خط سناتے میں کئی دفعہ چلمن کی طرف دیکھا۔ بار بار دیکھنے میں قاضی جی کی بیوی کی جھلک اسے نظر آگئی۔ قاضی جی کی بیوی بہت خوبصورت عورت تھی۔ اشفاق ایک ہی نظارے میں بیخود ہو گیا۔ اشفاق خط سنا چکا تو اندر سے ماما پان کی تھالی لیکر آئی۔ اشفاق پان کے بیڑوں کو عورت کی دلچسپی کا مظہر سمجھ رہا تھا۔

اس تکلیف کی کیا ضرورت تھی ——— اشفاق نے کہتے ہوئے ایک ساتھ دو بیڑے منہ میں رکھ لئے اور پان چباتے ہوئے بولا:-

کتنے مزیدار بیڑے ہیں ——— سبحان اللہ ———!

اشفاق کی بدنفسی اور آوارہ مزاجی نے اُسے قریب قریب یقین دلادیا تھا کہ خط پڑھوانے کا تو صرف بہانہ ہی اور ملاقات کی یہ تقریب اپنے پیچھے رنگین دلچسپیاں

رکھتی ہے۔ ماما نے اندر سے آکر کہا کہ اگر تکلیف نہ ہو تو ان خطوں کا جواب لکھ دیجئے
اشفاق نے جواب دیا..... ارے ! اس میں تکلیف کی کیا بات ہے۔ میں ایک خط کیا
دس خطوں کا جواب لکھ سکتا ہوں۔ ماما نے خط کا مضمون بتایا اور اشفاق نے خط
لکھنا شروع کیا، اُس نے دانستہ طور پر خط لکھنے میں بہت دیر لگائی۔ اشفاق نے خط
کا مضمون پڑھکر سُنایا تو اندر سے آواز آئی :۔

"آخر میں اتنا اور بڑھا دیجئے کہ اگر آپ جلد سے جلد نہ آئے تو پھر میں اپنے کسی
عزیز کو آگرے سے بُلوا کر پُونا چلی آؤں گی"۔

اشفاق اس پر بولا آپ فرماتی ہیں تو میں لکھے دیتا ہوں مگر آجکل جنگ کا زمانہ
ہے۔ سفر میں بڑی دقت پیش آتی ہے اور میں تو عرض کرتا ہوں کہ آپ اپنے مکان میں
ہی اطمینان کے ساتھ رہیئے۔ کچھ کام کاج ہو تو میں حاضر ہوں اور آج کل کے شوہروں کا
تو غریب اور بے زبان بیویوں کے ساتھ یہی سلوک رہتا ہے کہ خود تو شہروں میں مزے
کرتے ہیں اور بیویاں تنہائی میں تڑپتی رہتی ہیں۔ اس پر اندر سے کہا گیا اچھا تو اتنا
صرف بڑھا دیجئے کہ جس طرح ہو سکے آپ ایک دو دن کے لئے یہاں ضرور ہو جایئے
اشفاق نے عورت کے کہے ہوئے لفظ آخر میں بڑھا دئے۔

خط لکھنے کے بعد وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا، خاموش بیٹھنا تو مناسب نہ تھا
اس لئے اُس نے باتیں کرنی شروع کیں۔

یہ توتا بہت زیادہ کمزور ہے ——— اشفاق نے پنجرے کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔

جی ہاں ! یہ بہت دِن سے بیمار ہے ——— ماما نے جواب دیا۔

مجھے بھی پرندوں کا بہت شوق ہے۔ میرے یہاں کم سے کم دو درجن پرندے تو

ہوں گے۔ جب کوئی جانور اُداس رہنے لگتا ہے تو ہم اُسے لہسن کھلاتے ہیں ——

اشفاق چلمن کی طرف دیکھتے ہوئے بولا اس توقع کے ساتھ کہ چلمن کیطرف سے کچھ جواب آئے گا۔

اشفاق کی بات کا اندر سے کوئی جواب نہ ملا اور ماما صحن میں پھیلی ہوئی چادر کی تہ کرنے لگی۔

میں اب جاتا ہُوں ..... ! آپ کا جب کوئی کام ہو تو مجھے فوراً یاد فرمالیا کیجیے۔ آپ یہاں تنہا ہیں، بڑی پریشانی رہتی ہوگی آپ کو ..... ! میں خود بھی آکر آپ کی خیر خبر لیتا رہوں گا اشفاق نے اٹھتے ہوئے کہا اور اندر سے آواز آئی آپکی مہربانی کا شکریہ، ضرورت ہوئی تو آپ کو بُلا لیا جائے گا۔!

اشفاق اس مکان میں بڑی تیزی کیساتھ آیا تھا اور اب جاتے ہوئے اُس کے قدم آہستہ اُٹھ رہے تھے، اُس سے کوئی جھوٹے کو بھی کہہ دیتا کہ تھوڑی دیر اور رُک جاؤ تو وہ سچ کو ٹھیر جانا اور گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اتنی حسین عورت کی ہم نشینی روز روز تھوڑی میسر آتی ہے۔ اشفاق مکان پہنچا تو اس کے دوستوں کی پارٹی جمی ہوئی تھی وہ سب شور مچا کر بولے۔ بھئی ! اشفاق کہاں گئے تھے گھنٹوں سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔ اشفاق نے اس پر ایک ٹھنڈی سانس لی اور فاتحانہ انداز میں مُسکرایا۔

سرد آہیں اور پھر مسکراہٹ ! کہیں عشق وِشق تو نہیں لڑا رہے ہو اشفاق ایک دوست نے کہا۔

ارے ! شبیر وہ شعر تو سُناؤ جسکا پہلا مصرعہ ہے :-

خود آرہے ہیں اُن کی طرف سے پیامِ شوق —— اشفاق نے جواب دیا۔

مبارک ! مبارک ! بڑے قسمت والے ہو اشفاق ..... ! کہاں ہاتھ مار دیا ؟ ایک دوست شطرنج کی بساط بچھاتے ہوئے بولا اور تمام دوست اصرار کرنے لگے کہ بتاؤ کیا معاملہ ہے۔ اشفاق نے اس پر کہا :-

بھئی ! میں ناصر کے سوا اور کسی کو نہیں بتاؤں گا وہ بڑا گہرا آدمی ہے اور تم تو سب ہلکے پیٹ کے ہو۔ تم سے کسی بھید کہنے کا یہ مطلب ہے کہ تمام شہر میں ڈھنڈورا پٹ گیا !

تمام دوست بگڑ گئے خفا ہونے لگے، اشفاق کا دامن پکڑ لیا کہ بات بتانی ہوگی اور تم نے ہمیں اتنا غیر معتبر اور اُتھلا کیوں سمجھ لیا ہے، اشفاق نے کہا اچھا قسم کھاؤ اُس پر اسکے دوستوں نے کہنا شروع کیا :-

مرتے وقت ایمان نصیب نہ ہو جو ایک لفظ بھی کسی دُوسرے سے کہوں۔ !

قرآن شریف کی مار پڑے جو تمھارا بھید کسی کمبخت سے بیان کروں۔

کعبہ کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہتا ہوں کہ دوست اشفاق تیرا راز بس اس سینہ میں دفن ہو کر رہ جائے گا۔

اشفاق میاں ! ایشور کی سوگند آپ کی بات بس مجھی تک رہے گی۔

ابا جان کے سر کی قسم کسی اور کے کان میں بھنک بھی نہیں پڑ سکتی۔

اشفاق کا راز ہمارا راز ہے۔ ! خدا کو گواہ کر کے کہہ رہا ہُوں یہ بات۔ !

اشفاق نے اس پر کہا کہ اچھا تو سُنو :-

بھئی ! قاضیوں کی گلی سے میرا آنا جانا رہتا ہے۔ وہاں ایک پردہ نشین عورت نے مجھے آتے جاتے دیکھ لیا اور اُس نے اپنی ماما کے ہاتھ مجھے بُلایا۔ مَیں وہاں گیا،

دو تین خط مجھ سے پڑھوائے گئے ان کا جواب میں نے لکھا مگر یہ تو صرف بہانہ اور تقریب ملاقات تھی اصل مقصد تو مجھے اپنے یہاں بُلانا تھا۔ وہ عورت چلمن کے اندر بیٹھی رہی مگر میں نے کنکھیوں سے دیکھا کہ چلمن ہٹا ہٹا کر بار بار مجھے دیکھ رہی ہے۔ صاحب! عورت ...... خدا کی قسم قیامت ہے قیامت! ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ایک کیا ناک نقشہ ہی! اور رنگ! بالکل گلاب کی طرح سُرخ و سپید! میں نے تو اتنی خوبصورت عورت آج تک نہیں دیکھی! ہمارے شہر کی مشتری جان کے حُسن کا بہت شہرہ ہے مگر یہ تمھاری مشتری جان اُس عورت کے پیر کے ناخن کی برابری نہیں کر سکتی۔! واہ! سُبحان اللہ! کیا صُورت پائی ہے ظالم نے! ہاں تو بھیا۔! میں بہت دیر تک اُسکے یہاں بیٹھا رہا۔ اُس نے کچھ گفتگو بھی کی مگر جھجکتے ہُوئے اور پہلی ملاقات میں اس سے زیادہ بے تکلفی ہو بھی نہیں سکتی ...... ! چھالیہ کاٹتے میں اسکے ہاتھوں کی چوڑیوں کی آواز۔! جیسے کوئی میرے کان میں رَس ٹپکا رہا تھا.... صاحب! پھر اندر سے پانوں کی تھالی آئی، نہایت ہی سبک اور مزے دار بیڑے تھالی میں سبز الائچیاں قرینے سے رکھی ہوئیں ...... ! اُس بیچاری نے تو اپنے شوق اور دلچسپی کا سب کچھ اظہار کر دیا ...... لیکن میں بڑا ہی الو کا پٹھا ہوں۔ بُت بنا بیٹھا رہا ...... ! ایک لفظ مُنھ سے نہ نکلا ...... ! مگر میں بھی مجبور تھا ایک دوست نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا .... مجھے ہونا چاہیے تھا اشفاق کی جگہ... قہقہہ ......) رعبِ حسن نے زبان پر مہر لگا دی ...... ! اور ہاں! خوشی کی بات یہ ہے کہ عورت تنہا رہتی ہے اُس کا شوہر بہت دنوں سے پُونا میں ہے اور اُس کی بے توجہی کا یہ عالم ہے کہ بیوی خط پہ خط بھیجکر بُلا رہی ہے اور وہ آنے کا نام نہیں لیتا

بس دو ایک مُلاقاتوں میں بیڑا پار ہے ——!

دوستوں نے ہنستے ہُوئے اشفاق کو مُبارکباد دی، کسی نے اسکی پیٹھ ٹھونکی، کوئی گلے سے لپٹ گیا، کسی نے اشفاق کے حُسن کی تعریف کی کہ اشفاق کے چہرے پر بڑی پھبن اور جاذبیت ہے۔ مشورے ہونے لگے کہ اب کس طرح آگے قدم بڑھایا جائے۔ بے تکلفی کے لئے کونسی تدبیر مناسب ہو، کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اشفاق کے دوستوں کو شطرنج سے زیادہ دلچسپ مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ اُس دن اسی موضوع پر گفتگو ہوتی رہی اور طے یہ پایا کہ اوّل تو اس عورت کی ماما اشفاق کو بُلانے کے لئے بہت جلد آئے گی، اور اگر وہ نہ آئے تو اشفاق کو از خود وہاں جانا چاہیئے۔!

اشفاق دن میں کئی کئی مرتبہ مانگ پٹی کر کے قاضی جی کی بیوی کے مکان کے پاس سے گذرتا، چار پانچ دن تک تو اُس نے صبر کیا کہ آج ماما بلانے کے لئے آتی ہو۔ کل کوئی پیغام وصُول ہوتا ہے۔ مگر جب وہاں سے کوئی اِطّلاع نہ آئی تو وہ ایک دن خود ہی پہونچا، دروازے پر دستک دی، اندر سے ماما نکل کر آئی۔

آپ ہیں میاں ——! ماما قدرے حیرت انگیز لہجہ میں بولی۔

ہاں! اس لئے آیا تھا کہ بیگم صاحبہ کو کوئی خط لکھوانا تو نہیں ہو۔ اشفاق نے پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔

ماما یہ سن کر اندر گئی کہ میں بی بی سے پُوچھ کر آتی ہُوں۔ ماما نے اندر جاکر کہا کہ سکتر صاحب کے بھائی جو اس دن خط لکھنے کے لئے آئے تھے، دروازے پر کھڑے ہوئے دریافت کر رہے ہیں کہ کوئی خط لکھوانا تو نہیں ہو۔ قاضی جی کی بیوی

نے کہا کہ اُن سے کہہ دو کہ آپ کی مہربانی کا شکریہ۔ جب خط لکھوانے یا پڑھوانے کی ضرورت ہوگی تو آپ کو بُلوا لیا جائے گا۔ ماما نے قاضی جی کی کہی ہوئی بات اشفاق کے سامنے دہرا دی۔ اشفاق نے کچھ سوچا اور پھر بولا:-

جنگ کا چندہ ہو رہا ہے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی حیثیت کے مُطابق چندہ دینا ہوگا —! میں اسی کے متعلق آپ کی بی بی سے کچھ کہنا چاہتا ہوں —!

ماما نے قاضی جی کی بیوی سے جا کر اشفاق کی بات کہی اور اشفاق کو اندر بُلا لیا گیا اشفاق نہایت بے تکلفی کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا اور ہاتھ کا پنکھا جھلنے لگا۔

میں اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ میرے بھائی کو تو آپ جانتی ہوں گی —! وہ میونسپلٹی کے سکتر ہیں۔ اور جنگ کا چندہ بھی اُنہی سے متعلق ہے —! آپکے نام کوئی سرکاری نوٹس آئے تو مجھے اطلاع کرا دیجئے۔ میں بھائی صاحب سے کہکر چندہ مُعاف کرا دوں گا۔

اندر سے آواز آئی:-

آپ کا شکریہ ......!

تھوڑی دیر خاموشی رہی، اشفاق نے پینے کے لئے پانی مانگا۔ ماما کورے گھڑے سے پانی لیکر آئی۔

یہ تو بہت گرم ہے، تم ذرا تکلیف کر کے برف تو لے آؤ ——— اشفاق جیب سے پیسے نکالتے ہوئے بولا، اشفاق کا ہاتھ جیب ہی میں تھا کہ اندر سے دیوار بجانے کی آواز آئی ماما اندر گئی اور مُٹھی میں پیسے دبا کر برف لینے کے لئے باہر چلی گئی۔

مکان میں اب بالکل تنہائی تھی۔ اشفاق نے سہی تنہائی کے لئے تو برف کا قصہ نکالا تھا۔

تو آپ بالکل تنہا رہتی ہیں اس مکان میں ——— اشفاق نے چلمن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

جی ہاں ——— اندر سے بھنچی ہوئی آواز آئی۔

تنہائی میں آپ کو ڈر نہیں لگتا ——— اشفاق نے جواب دیا اندر سے اس کا کوئی جواب نہیں ملا۔ اشفاق نے سمجھا کہ شرم حائل ہے، بس ذرا شرم کا پردہ اٹھ جائے پھر تو کامیابی ہی کامیابی ہے۔

آپ حکم دیں تو میں کبھی کبھی یہاں آجایا کروں ——— اشفاق بولا۔

خط پڑھوانے کی ضرورت ہوئی تو میں خود آپ کو بلالوں گی۔ قاضی جی کی بیوی نے جواب دیا۔

آپ میرا مطلب سمجھی نہیں ..... ! اور اگر سمجھ گئی ہیں تو انجان بن رہی ہیں میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ میں آپ کے یہاں آجایا کروں گا ——— اشفاق نے پنکھا تخت پر رکھتے ہوئے کہا۔

ضرورت ہوئی تو آپ کو بلوالیا جائیگا ——— قاضی جی کی بیوی بولیں۔

اِسوقت تو تنہائی ہے ..... ! آپ کھل کر گفتگو کیوں نہیں کرتیں۔ ماما تو بہت دیر میں آئے گی ..... ! سچ جانئے آپ سے ملنے کے بعد طبیعت بےچین رہی اور یہی بےچینی یہاں کھینچ کر لائی ہے ..... ! دیکھئے۔ ! ابتدا آپ ہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ آپ ہی نے ماما کے ہاتھ مجھے بلوایا، اب سب کچھ آپ کے

ہاتھ میں ہے۔ میں تو ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں..... ! مجھے آپ بہت وفادار پائیں گی........ ! اشفاق نے یہ کہتے ہوئے چلمن کی طرف ہوسناک نگاہوں سے دیکھا اور قاضی جی کی بیوی نے گھبرا کر دروازہ بند کر دیا۔ اتنے میں ماما برف لیکر آگئی۔ ماما کے آتے ہی اشفاق سٹ پٹا کر کھڑا ہو گیا۔ ماما نے کہا میاں! کہاں چلدیئے، میں برف کا پانی بناتی ہوں۔ اس پر اندر سے آواز آئی برف کو پانی میں پھینک دو۔ اس غضبناک آواز کو سنکر اشفاق یہ کہتے ہوئے کہ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا۔ وہاں سے چلا گیا۔

اشفاق کے دوست منتظر تھے کہ آج ان کا خوبصورت دوست اور زیادہ مزیدار بات سنائے گا۔ اشفاق کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں جیسے کسی نے اس کی خوب کفش کاری کی ہے۔ دوستوں نے دریافت کیا کیوں! بھئی! خیر تو ہے اتنے بدحواس اور گھبرائے ہوئے کیوں ہو! اشفاق نے کہا کہ اس قسم کی بدمعاش عورتیں سیدھی طرح قابو میں نہیں آتیں۔ ان کے ساتھ تو شرارت آمیز چال چلنے کی ضرورت ہے۔ لوہا لوہے کو کاٹتا ہے شرافت اور بھلمنساہت سے کام نہیں چلتا۔ اس کے بعد اشفاق نے ایک خود تراشیدہ افسانہ سُنا دیا کہ میں وہاں اس طرح گیا اُس نے یہ جواب دیا۔ یوں بے تکلفی کی ابتدا ہوئی اور پھر فلاں بات پر اَن بَن ہو گئی — !

اشفاق نے اپنے دوستوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی کہ وہ عورت یقیناً آوارہ اور رنگین مزاج ہے اور ایسے شکار کو چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ اشفاق کے دوستوں نے فیصلہ کیا کہ اُس عورت کو دق کرنا چاہیئے، اس طرح مرعوب ہو کر

وہ خود رام ہو جائے گی۔ ان آوارہ منشوں نے اب یہ کیا کہ قاضی جی کے مکان کے سامنے تالی بجاتے، مکان میں ڈھیلے پھینکتے۔ ماما کی زبانی محبت کے پیغام بھیجتے اور ایک دن تو اشفاق کا ایک دوست شام کے بعد مکان میں داخل ہو گیا وہ تو یہ غنیمت ہوا کہ قاضی جی کی بیوی چھت پر تھی ورنہ یہ بدمعاش تو کچھ اور ہی ارادہ کر کے گیا تھا۔ قاضی جی کی بیوی ڈر کے مارے اندر باہر کا دروازہ لگائے گھر میں بیٹھی رہتی، اس غریب کا وہاں کون تھا۔ شوہر سے ہمدردی اور حفاظت کی توقع ہو سکتی تھی سو وہ خدا کا بندہ تجارت کے سلسلے میں ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ بیوی کے خط پہ خط بُلانے کے لئے گئے اور وہ نہ آسکا ....!

قاضی جی کی بیوی ماما کو اکرم کے یہاں بھیجتی رہتیں، چند دن کے بعد اکرم آ گیا۔ ماما نے اُس سے جا کر کہا کہ بی بی کو آپ کا بڑا انتظار ہے چلئے ابھی چلئے! اکرم وہاں پہنچا اور سرکنڈوں کے بنے ہوئے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ اندر سے رونے کی آواز آئی: قاضی جی کی بیوی زور زور سے رونے لگی۔ اکرم کو وہ اپنا ہمدرد سمجھتی تھی اور دُکھا ہوا دل ہمدرد اور غمخواروں کو دیکھ کر بے قابو ہو ہی جاتا ہے۔ اکرم نے یہ سمجھا کہ خدانخواستہ پُونا سے کوئی بُری خبر آئی ہے۔

کہئے ....! پُونا میں تو ہر طرح خیریت ہے ......! آپ روتی کیوں ہیں، کچھ کہئے تو سہی ......! اکرم نے پریشان ہو کر کہا اور اس پر قاضی جی کی بیوی نے اشفاق اور اسکے دوستوں کی چھیڑ چھاڑ کی تمام داستان رو رو کر سنا دی۔ اکرم نے کہا آپ ملول اور دل شکستہ نہ ہو جیے۔! میری تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ یہ آج کل کے آوارہ نوجوان ایسی ہی حرکتیں کرتے

رہتے ہیں۔ شریف آدمیوں کو اپنی عزت آبرو بچانی دشوار ہوگئی ہے۔ ان کا مقابلہ کرو تو اور ذلت اور جگ ہنسائی ہوتی ہے.....!

قاضی جی کی بیوی نے جواب دیا:—

آپ کی مہربانی کا شکریہ! مجھے آپ سے ایسی ہی اُمید تھی...... مگر اس مکان میں تنہا رہتے ہوئے مجھے تو خوف لگتا ہے، دِن بھر قفل لگائے اور دروازہ بند کئے پڑی رہتی ہوں..... کیا کروں کیا نہ کروں.....! وہ پُونا سے مہینہ کے آخر پر آجائیں گے مگر جب تک کیا ہوگا.....!

اکرم نے کہا کہ قاضی صاحب کے آنے تک آپ میرے مکان میں چلکر رہیئے، وہاں آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ان آوارہ لونڈوں کو ٹوکنا بھی مناسب نہیں۔ یہ لونڈے شہر کے کھاتے پیتے لوگوں کے بیٹے ہیں، پولیس میں اطلاع دی گئی تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا رپٹ کرانے والے کے پیچھے اُلٹی بلا پڑجائیگی اِس مکان میں آپ کا تنہا رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ عزت آبرو کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں۔ لوگ ذراسی بات کو نمک مرچ لگاکر کچھ سے کچھ مشہور کر دیتے ہیں۔ قاضی جی کی بیوی نے اکرم کے گھر جانے کی ہامی بھرلی۔ اکرم نے کہا آپ تیار ہوجائیے ضروری اور قیمتی سامان اپنے ساتھ لے لیجیے۔ مَیں شام کے وقت آپ کو لینے کے لئے آؤں گا.....!

اکرم نے یہ تمام قصہ بیوی سے جاکر کہا اس کی بیوی تو پہلے ہی سے کھٹکی ہُوئی تھی وہ سمجھی کہ یہ سب افسانہ گھڑا گیا ہے اور اکرم اپنی دلچسپی کے لئے اس عورت کو یہاں لارہا ہے۔ اکرم کی بیوی نے بہت سختی کے ساتھ مخالفت کی۔ اکرم فیصلہ کرچکا تھا۔

قاضی جی کی بیوی کو زبان دے چکا تھا۔ ایک شریف عورت کی عزت آبرو کا خطرہ اس کی نگاہ میں تھا وہ شام کو گیا اور قاضی جی کی بیوی کو اپنے یہاں لے آیا۔ قاضی جی کی بیوی نے اپنے شوہر کو پونا خط لکھوایا کہ مکان میں چوروں اور بدمعاشوں کا بہت خطرہ تھا، اس لئے میں ایک نہایت ہی شریف آدمی کے یہاں آگئی ہوں آپ فوراً آئیے۔ اس خط میں اکرم کے مکان کا پتہ مفصل طور پر لکھا گیا۔

اکرم کی بیوی پر رقابت کا بھوت سوار تھا وہ تو قاضی جی کی بیوی کو اپنی سوکن سمجھتی تھی۔ قاضی جی کی بیوی سے اس کو ہمدردی تو کیا ہوتی اور عداوت ہوگئی اکرم نے اسے سمجھایا بھی اور پورا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا۔ مگر ایسی باتوں سے بدگمانی اور بڑھتی ہے۔ اکرم کی بیوی نے اچھی طرح محسوس کیا کہ قاضی جی کی بیوی نے ایک دن بھی اکرم سے بات چیت نہیں کی۔ کچھ کہنا ہوتا تو ماما کے ذریعہ کہلوا دیتی۔ اکرم زنانہ میں شاذ و نادر ہی آتا تھا، مردانہ نشست گاہ میں وہ رہتا اور وہیں کھانا منگا لیتا۔ اکرم کے طور طریق میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ مگر اسکی بیوی کے تیور ہر وقت پُرشکن رہتے تھے۔ قاضی جی کی بیوی نادان نہ تھی، اُسے اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ اکرم کی بیوی کو اس کا وہاں رہنا پسند نہیں ہے۔ مگر غریب کیا کرتی۔ یہ تلخ جام اُس کو بہر حال گوارا کرنے تھے۔

اکرم کی بیوی نے اپنے میکے میں خط بھیجدیا کہ اکرم صاحب ایک عورت کو گھر میں لے آئے ہیں۔ اس خط کے پہنچتے ہی اکرم کے سسرال والوں کی ایک پلٹن وہاں آدھمکی۔ انھوں نے آکر دیکھا کہ ایک خوبصورت عورت اکرم کے یہاں ٹھیری ہوئی ہے۔ عورتوں نے قاضی جی کی بیوی سے سوالات کیا جرح کرنی شروع کی کہ تمھارا

شوہر باہر کیوں رہتا ہو اور باہر رہتا ہے تو تمھیں اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھتا۔ اکرم سے تمھاری جان پہچان کیونکر ہوئی۔ شوہر کی غیر موجودگی میں اُن سے پوچھے بغیر تم ایک بالکل غیر مرد کے یہاں کیوں آگئیں۔ قاضی جی کی بیوی سے جہاں تک بن پڑا تمام سوالات کے جواب اُس نے دئے۔ مگر اسکے ہر جواب کو فریب اور بناوٹ سمجھا گیا۔ ان عورتوں کے فقرے کتنے دل خراش تھے۔

کتنا بُرا زمانہ آگیا ہو شریف عورتیں پرائے مردوں کو پھانستی ہیں۔

شوہر نے اتنے دن سے چھوڑ رکھا ہو تو کوئی ایسی بات ہی ہو گی۔

اس زمانہ میں خوبصورت عورتوں کے یہی فضیحتے سُننے میں آتے ہیں۔

ہماری عفت (اکرم کی بیوی) تو اس گھر کی تنہا مالک ہو اور رہے گی۔ اکرم صاحب نے کچھ تین پانچ کی تو کچہری عدالت کے ذریعہ اُن کی خبر لیجائے گی۔

اجی! میاں اکرم سے تو شادی کے وقت دو ہاتھ کا کاغذ لکھوا لیا گیا ہے کہ دوسرا بیاہ وہ ہماری لڑکی کے جیتے جی کر ہی نہیں سکتے۔ میرے ماموں ڈپٹی کلکٹر ہیں ان کو معلوم ہو گیا تو قیامت ہی آجائے گی۔

قاضی جی کی بیوی تنہائی میں گھنٹوں روتی۔ عورتوں کے یہ طعنے اُس کے لئے ناقابلِ برداشت تھے۔ "نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن" کی مثل اسکے حسبِ حال تھی۔ وہ جہاں پناہ لینے کے لئے آئی تھی اُس جگہ کا ذرہ ذرہ اُس کا دشمن تھا۔ اس پاکدامن خاتون کو بدگمانی کی نگاہ سے دیکھا جا رہا تھا۔ ہر نگاہ اُس کے لئے تیر و نشتر تھی بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھکر ...... ! اُس کے دکھے ہوئے دل پر دن رات کچو کے لگتے رہتے ......!

اکرم کی خوشدامن بڑی باتونی اور جلال کی عورت تھی۔ اس واقعہ نے تو اسے اور ہزار داستان بنا دیا۔ اُس نے اکرم سے پُوچھا کہ یہ عورت یہاں کیسے آئی۔ اکرم نے نہایت صاف دلی کے ساتھ تمام واقعات بیان کر دئے اسپر وہ بڑھیا بولی :-

اکرم میاں! مجھے بے وقوف نہ بناؤ، میں نے دُھوپ میں اپنا چونڈا سفید نہیں کیا۔ اتنا شہر بھرا پڑا ہے اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے بس تم رہ گئے تھے ..... ! آوارہ عورتوں ہی کو لونڈے چھیڑا کرتے ہیں۔ تمھارے گھر پر بھلا کوئی بدمعاش تالی آکر کیوں نہیں بجاتا .... ! اب رہا صورت شکل کا معاملہ تو صورت شکل طوائفوں اور کسبنوں کی اچّھی ہوتی ہی۔ شریف بہو بیٹیوں کی کہیں صورت دیکھی جاتی ہی، اور پھر ہماری عفت اللہ کے فضل سے آنکھ ناک سے درست ہے ..... ! اکرم میاں : آپ جو چاہتے ہیں قیامت تک نہیں ہو سکتا، آپ کو اس عورت سے ہمدردی ہی تو ہمیں اپنی بیٹی کا خیال ہی عفت کو ہم برباد ہوتے نہیں دیکھ سکتے ...... ! ہمارے گھر میں ایک چھوڑ چار وکیل موجود ہیں۔ نرمی سے کام نہ نکلے گا تو سختی کیجائے گی، ہم نے یہ رشتہ اِس لئے تھوڑی کیا ہے کہ ہماری بیٹی کے سر پر سوکن بٹھا دی جائے۔

اکرم نے بہت سمجھایا کہ تم لوگوں کا خیال غلط ہی نہیں بیہُودہ اور شرارت انگیز ہے۔ شریف آدمیوں کے ذہن میں بھی ایسے خیالات نہیں آنے چاہئیں آپ لوگ میرے بڑے ہیں مجھے جو کچھ چاہے کہہ لیجئے، مگر خدا کے لئے اُس شریف عورت پر تہمت نہ جوڑیئے وہ بالکل بے گناہ ہے، ایک شکستہ حال مصیبت زدہ اور بیکس انسان کے زخموں سے کھیلنا اچھا نہیں، اکرم جتنی صفائی پیش کرتا اُتنی ہی

بدگمانی بڑھتی جاتی۔

اکرم کے سسرال والوں کی یہ فوج ابھی اسکے یہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی کہ قاضی جی پونا سے آ گئے۔ بیوی کی اس حرکت کو انھوں نے انتہائی ناپسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا کہ وہ ایک غیر مرد کے یہاں کیوں چلی آئی۔ اکرم کے سسرال والوں نے قاضی جی کو اور بدظن کر دیا کہ آپ اپنی بیوی کی نگرانی کیجیے زمانہ نازک ہے۔ قاضی جی پہلے ہی سے بھرے بیٹھے تھے، ان لوگوں کی باتیں سنکر اور آتش زیرپا ہو گئے اکرم سے ملکران کا شبہ یقین سے تبدیل ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ساز باز ضرور ہے اکرم جوان آدمی تھا اور قاضی کی عمر پچاس سال کے قریب تھی۔ اکرم کی بیوی کو قاضی جی کی بیوی کی خوبصورتی نے شبہ میں ڈال دیا تھا اور اکرم کی جوانی نے قاضی جی کو بدگمان کر دیا۔ حسنِ معصوم اور شباب بے گناہ اس فتنہ کی بنیاد بن گئے۔ قاضی جی نے بیوی کو طلاق دے دی۔ قاضی جی کی بیوی کا برا حال تھا، مطلقہ بیوی کو ہندوستان میں یوں بھی بری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسے تو بدچلنی کے الزام میں طلاق دی گئی تھی۔

اکرم نے قاضی جی کی بیوی کو تسکین دیتے ہوئے کہا کہ میں تمھیں اپنی بہن سمجھتا ہوں، تم کسی بات کی فکر نہ کرو مجھے اپنا بھائی سمجھکر یہاں رہو دنیا بہت ہی بری اور خود پرست ہے تم نے اس واقعہ کی اپنے گھر والوں کو اطلاع دی تو وہ بھی تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہ کریں گے۔ تم گھبراؤ نہیں جو خدا بگاڑ سکتا ہے وہ بنا بھی سکتا ہے۔ اللہ کے فضل پر نظر رکھو ڈوبتوں کو ترانے والا وہی ہے۔

اکرم کے سسرال والوں نے جب یہ رنگ دیکھا کہ قاضی جی کے طلاق

دینے کے بعد بھی اُس عورت کو اکرم نے اپنے یہاں رکھ لیا تو اُن کی بدگمانی یقین بن گئی کہ اکرم نے یہ جھوٹ کا قلعہ اسی لئے تیار کیا تھا۔ انھوں نے اکرم کو دھمکی دی بُرا بھلا کہا خود اکرم کی بیوی نے نہایت سختی کے ساتھ دُو بدُو گفتگو کی اکرم نے جواب دیا:۔

جہانتک مجھ سے ممکن تھا میں نے آپ لوگوں کی غلط فہمی دور کرنیکی کوشش کی، لیکن آپ لوگ میرے سر پر چڑھے آتے ہیں۔ مَیں کہتا ہُوں کہ اسلام میں دو نہیں چار بیویاں کرنے کی اجازت ہو۔ اور کسی شوہر سے کوئی بیوی یا اس کے سُسرال والے اس حق کو نہیں چھین سکتے۔! یہ شریف عورت میرے یہاں رہے گی، میں اُسے اپنی بہن کہہ چکا ہوں اور میں اپنی بات کو انشاء اللہ نباہ کر دکھاؤں گا۔ اَب رہیں آپ کی دھمکیاں تو آپ اپنے رشتہ دار مجسٹریٹوں اور عزیز وکیلوں سے کہکر مجھے پھانسی دلوا دیجئے، مجھے یہ سزا قبول ہے۔ تم لوگوں کو اپنی امیری پر گھمنڈ ہے تو میرا بھی خدا ہو...... ! اور ہاں ! میں اپنی بیوی سے دو سال تک کسی قِسم کے تعلقات رکھنا نہیں چاہتا..... ! یہ میرا اٹل فیصلہ ہے میں زبان سے اس کا اعلان کر چکا اور شریعت کی رُو سے آج سے دو سال تک میرے اور میری بیوی کے تعلقات قائم نہیں رہیں گے...... ! آپ لوگوں کو جو کرنا ہو کر لیجئے۔

اکرم کے سُسرال والے اپنی لڑکی کو لیکر چلے گئے۔ اکرم نے اپنی خالہ اور چچازاد بیوہ بہن کو بُلا لیا کہ آپ لوگ میرے یہاں چند دن تک رہیں۔ اکرم اس عرصہ میں زیادہ تر جنگل میں رہا۔ قاضی جی کی مطلقہ بیوی کی اُس نے انتہائی دل دہی کی اور اسے یہ بات محسوس تک نہ ہونے دی کہ وہ کسی غیر کے گھر میں رہتی ہو۔ اکرم نے اس سے حقیقی بہن کی طرح برتاؤ کیا۔ عدت کی شرعی مدت گزرجانے کے بعد اکرم نے اپنی خالہ اور چچازاد

بہن سے کہا کہ قاضی جی کی بیوی کی مرضی کی ٹوہ لگاؤ اگر وہ شادی کے لئے راضی ہوں تو میں اپنے ایک نہایت ہی شریف دوست کیساتھ ان کا رشتہ کرا دوں۔

اکرم کی منھ بولی بہن نے شادی کی ہامی بھرلی دوسری طرف وہ اپنے دوست کو رضامند کر چکا تھا، اکرم نے حقیقی بہن کی طرح اسکو رخصت کیا۔ دین لین جہیز بارات کی خاطر و مدارات غرض کسی بات میں اسنے کمی نہیں کی۔ اکرم نے روتے ہوئے اسے ڈولی میں سوار کرایا، اسکی آنکھوں سے بھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے منھ بولا رشتہ حقیقی محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ سچ مچ بہن بھائی کے گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔ اکرم کی بہن نے چلتے وقت کہا کہ بھاوج کو خدا کے لئے اب اپنے یہاں بلا لیجئے۔ ان کا قصور نہیں تھا انکے پاس بدگمانی اور شبہ کے اسباب موجود تھے.....!

اکرم کے سسرال والوں کو تو یقین تھا کہ اکرم اس عورت کیساتھ اپنا بیاہ رچائیگا وہ تو اکرم کیساتھ مقدمہ بازی کی فکر میں تھے یہ خبر سنکر کہ اکرم نے اپنے ایک دوست سے اس عورت کا بیاہ کرا دیا۔ انکو بڑی ندامت ہوئی مصالحت کیلئے سلسلہ جنبانی کی گئی اپنی غلطی کی معافی چاہی گئی، اکرم نے کہا میرے منھ سے جو الفاظ نکلکر شرعی حیثیت اختیار کر چکے ہیں انکی تکمیل بہر حال ہو گی اور ابھی ایک سال تک اور میری بیوی کو اپنی حماقت کی سزا بھگتنی پڑے گی!

اکرم اپنی منھ بولی بہن کو ہمیشہ حقیقی بہن سمجھتا رہا۔ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اسلامی اخوت کا رشتہ اپنے اندر کس قدر پاکیزگی اور استحکام رکھتا ہے۔ مرد مومن کا قول حق کی زبان ہوتی ہے.....! یہ واقعہ آس پاس اتنا مشہور ہو گیا کہ مائیں اپنی بیٹیوں کو دعا دیتے ہوئے کہا کرتی تھیں کہ تمہیں اکرم جیسا جاں نثار بھائی ملے......!

دُلھن

طاہر نہ تو فلسفی تھا اور نہ شاعر، مگر اس میں بدحواسی، تلوّن اور گھبراہٹ کے آثار پائے جاتے تھے۔ اس کی گھبراہٹ بہت ہی معصوم اور دلچسپ ہوتی تھی۔ پلیٹ فارم پر ٹرین آ چکی تھی۔ طاہر ٹکٹ کی کھڑکی پر پہونچکر دونوں ہاتھوں سے شیروانی کی جیب تلاش کر رہا ہے مگر جیب نہیں ملتی۔ یہاں تک کہ ٹرین نے سیٹی دی اور طاہر ٹکٹ لئے بغیر ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راستہ میں ٹکٹ چیکر نے ٹکٹ مانگا تو طاہر نے کہا کہ مجھے ٹکٹ نہیں مل سکا جتنا کرایہ آپ کہیں میں دے دُوں۔

تو کیا آپ چلتی گاڑی میں سوار ہوئے تھے۔ ٹکٹ لینے کا شاید آپ کو وقت نہ مل سکا ٹکٹ چیکر نے دریافت کیا۔

جی نہیں.... ! میں ٹکٹ کی کھڑکی پر پہنچ چکا تھا مگر جس جیب میں روپے تھے وہ جیب .... گھبراہٹ میں مجھے ملی نہیں... ! پلیٹ فارم پر تو قیامت کا منظر ہوتا ہے .... طاہر نے جواب دیا۔

ٹکٹ چیکر بھی بڑا ہی خوش مزاج اور سادہ طبیعت انسان تھا طاہر کے اس جواب پر مسکرا کر بولا، تو جن مسافروں کو گھبراہٹ میں اپنی جیب نہیں ملتی اور

وہ نیک نیتی کے ساتھ ریل میں بے ٹکٹ سوار ہو جاتے ہیں میں اُن سے باز پرس نہیں کرتا۔ ایسے معصوم اور دلچسپ لوگوں کے لئے ریل کی کھڑکیاں ہر وقت کھُلی رہتی ہیں ......!

ایک مرتبہ اُس نے ایک بالکل اجنبی اور غیر آدمی کو اپنا دوست سمجھکر پیچھے سے دھکا دے کر گرا دیا۔ اُس آدمی نے گرنے کے بعد مڑ کر دیکھا ہی تو طاہر کو شرم کے مارے پسینہ آگیا۔ گرنے والا آدمی آستین چڑھا چکا تھا اور طاہر سے کشت مشت ہونے والی تھی کہ طاہر نے اُس سے معافی مانگتے ہوئے کہا:-

"خدا کے لئے میری اس غلطی کو معاف کر دیجیے...... ! میرے ایک نہایت عزیز دوست آپ ہی جیسے ہیں۔ یہی قد، ایسا ہی چہرہ مہرہ! میں پیچھے سے یہی سمجھا کہ میرے دوست جا رہے ہیں اسی بھول اور غلط فہمی کے سبب مجھ سے قصور ہو گیا۔ میں بعض وقت کچھ بدحواس بھی ہو جاتا ہوں ......!"

گرنے والے آدمی کے خشمناک تیوروں میں عفو و درگذر کی سپیدی دوڑ گئی اُس نے جاتے ہوئے کہا:-

"میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اسی سڑک پر آپ کا گریبان تھام لیتا.... ! آپ اپنی بدحواسی اور گھبراہٹ کا علاج کرائیے ......!"

یہی بدحواس اور متلون طاہر اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سگرٹ پی رہا تھا.....

طاہر کا کمرہ...... ! میزوں پر ادھ جلی سگرٹیں پڑی تھیں، ردّی کاغذوں کے پرزے ان کبوتروں کی طرح ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے جن کے پر کھول کر اُڑنا سکھایا جاتا ہی کمرے کا قالین تو ایرانی تھا مگر اُگالدان اُلٹ جانے کے سبب جگہ جگہ کچھ سرخی مائل

خاکے بنے ہوئے تھے جیسے کسی نے ملکوں کے نقشے کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ میز پر کتابیں بکھری ہوئیں، کچھ کتابوں کی جلدیں پھٹی ہوئی تھیں اور بعض کے آگے پیچھے کے اوراق ہی سرے سے غائب تھے۔ بہت سی کتابوں میں نشانیاں رکھی تھیں جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ یا تو کتاب پڑھنے والے نے ایک بھی کتاب ختم نہیں کی یا وہ روزانہ اتنی بہت سی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر بہت سے پرانے کیلنڈر اور دواؤں کے اشتہار لٹک رہے تھے، ایک چھوڑ تین تین ٹائم پیس مگر غیر متحرک اور خاموش جیسے انھوں نے ستیاگرہ کر رکھی ہے۔ ! طاہر کا کمرہ کیا تھا عجائب خانہ تھا۔ اور عجائب خانہ بھی اپنے انداز کا بالکل نیا کہ دیکھنے والا ہنسنے پر مجبور ہو جائے .... ! طاہر کے کمرے کو ہم بدسلیقگی پر بھی محمول نہیں کر سکتے کیونکہ بدسلیقگی کو دیکھ کر کوفت ہوتی ہے، مگر یہاں کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے سے تو دل میں گدگدی سی پیدا ہوتی تھی ......

طاہر اپنے اسی "دارالانطبقات" میں بیٹھا ہوا یہ شعر:-

میں نے ہر فصل بہاراں میں نباہی توبہ
اب کے ساماں ہیں کچھ ایسے کہ الٰہی توبہ

گنگنا رہا تھا۔ اردو کا یہ شعر پورا بھی نہ ہوا تھا کہ فارسی کی یہ غزل:-

ستم است گر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو و سمن درآ

چھیڑ دی اور غزل کے دو تین شعر پڑھنے کے بعد ہی اُردو فلم کا یہ مشہور گانا گانے لگا:-

گھٹا گھنگور گھور مور مچائیں شور .... مورے سجن آجا

طاہر کا تلوّن کسی ایک نقطہ پر ٹھیر ہی نہیں سکتا تھا۔ اُس کی فطرت کو تو قدرت نے

بجلی اور پارے کی آمیزش سے شاید بنایا تھا۔ فلمی گانا گاتے گاتے جو جُنگ سوار
ہوئی تو فاؤنٹن پین میں سیاہی بھرنے لگا۔ روشنائی کی شیشی اُس نے اس طرح
اُلٹی کہ ہاتھ، میز پوش اور کرتہ کی آستین پر آسمانی رنگ کے دھبے پڑ گئے وہ اپنی
اس حماقت پر خود ہی جھنجلا کر بولا :۔

"ان میرے یار ولایت کے لوگوں کو بھی بیٹھے بٹھائے نئی سُوجھتی ہے
دوات، قلم سے اچھا خاصہ لکھا جاتا ہے، انھوں نے فاؤنٹن پین نکال دیا.... !
چاہے کسی کے کپڑے ہی سیاہی میں کیوں نہ تر بہ تر ہو جائیں ......؟

اُس نے فاؤنٹن پین سے کاغذ پر دو تین سطریں لکھیں اور کاغذ پھاڑ کر
پھینک دیا۔ دوسرا کاغذ اُٹھایا پہلے اُس پر تتلی کی تصویر بنائی پھر دو چار لکیریں
کھینچیں اور لکھنا شروع کیا :۔

"ڈیر حامد...... آداب...... !

اُس نے کچھ سوچکر اپنے لکھے ہُوئے پر قلم پھیر دیا اور بولا :۔

"ڈیر تو انگریزی لفظ ہے.... ! انگریزی زبان اور انگریزی تمدن کی آخر
کب تک پرستش کیجائے گی۔ اُردُو زبان میں اس سے اچھے الفاظ موجُود ہیں..!"
دو چار لفظ لکھنے کے بعد اُس نے خط لکھنے کا کاغذ اٹھا کر رکھدیا اور
کہنے لگا :۔

"اب تو ڈاک کا وقت بھی نکل گیا.... اب کل اوّل وقت خط لکھونگا
لاؤ کل والا مضمون پُورا کر لوں ...... !"

اُس نے میز کی دراز سے کاغذوں کا پلندا اُٹھایا جس میں بہت سے کاغذ

لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کاغذوں میں کیا تھا۔ یہ نہ پوچھئے؟ دُنیا کے ہر موضوع پر کاغذات کے اُس پلندے میں کوئی نہ کوئی مضمون، نوٹ یا کم سے کم دو تین سطریں ضرور لکھی ہوئی تھیں ......!

اُس نے کاغذوں سے مضمون ڈھونڈ کر نکالا اور ذرا سی دیر میں ایک صفحہ لکھ ڈالا۔ اُس نے ورق پلٹا ہی تھا کہ پھر ترنگ آئی اور بولا:۔

"اس طرح کام نہیں چلے گا مجھے اس موضوع پر کچھ نہ کچھ پڑھنا چاہیئے۔ مطالعہ کے بغیر کچھ لکھنا حماقت ہی نہیں فریب کاری بھی ہے......!"

اُس نے مضمون پھر اُسی پلندے میں لپیٹ کر رکھ دیا اور انگریزی کا ہفتہ وار مصوّر رسالہ پڑھنے لگا۔ ایک تصویر پر اُس کی نظر جم کر رہ گئی۔ یہ ایک خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی جس کے نیچے لکھا ہوا تھا کہ اس لڑکی نے سائیکل کی دوڑ میں اوّل انعام حاصل کیا ہے۔ تصویر واقعی بہت زیادہ دلکش اور جاذبِ نظر تھی حُسن نے طاہر کے تلوّن کو ایک جگہ ٹھیرا دیا تھا۔ وہ بہت دیر تک تصویر دیکھتا رہا مشاہدہ کے غیر معمولی انہماک نے تصویر کے نقوش کو اور زیادہ اُبھار دیا تھا۔

اس ظالم نے ساری کس انداز سے پہنی ہے......! اور مسکراہٹ......! میرے تو ہونٹوں میں گدگدی ہو رہی ہے......! جب نقل کا یہ عالم ہے تو اصل قیامت ہوگی...... قیامت......!...... طاہر تصویر کی دلکشی پر ابھی تبصرہ کر ہی رہا تھا کہ پوسٹ مین نے گلی سے آواز دی کہ ڈاک لیجاؤ......!

......آؤ...... اندر آؤ...... طاہر تصویروں کا اخبار میز پر رکھتے ہوئے بولا پوسٹ مین نے اندر آکر سلام کیا اور بولا:۔

"آپ کے نام ایک بیرنگ لفافہ ہے......!
اس پر طاہر نے پوسٹ مین کے ہاتھ سے لفافہ لیتے ہوئے کہا:-
ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے
اس نے گھبرا کر لفافہ چاک کیا اور خط پڑھتے ہوئے بولا:-
"ارے! نصرت نے مذاق کیا ہے.....! اس بدنصیب کو ستانے
میں مزہ آتا ہے.... اور خط کا مضمون تو دیکھئے.... آپ لکھتے ہیں:-
"میں اس وقت موچی کی دوکان کے سامنے مونڈھے پر بیٹھا ہوا جوتے
کی مرمت کرا رہا ہوں، تمھاری یاد بے اختیار آ گئی، میرے پاس نہ تو ڈاک کا
محصولی لفافہ ہے اور نہ کوئی کارڈ ہے......! اتفاق سے جیب میں سادہ
لفافہ پڑا تھا، کاغذ کی مشکل اس طرح حل ہو گئی کہ راستہ سے سینما والے اشتہار بانٹتے
جا رہے ہیں میں نے اشتہار کی پشت پر ہی تمھیں خط لکھ دیا۔ خلوص و محبت میں
رسم و تکلفات کی کیا ضرورت ہے.....! سچی دوستی تو سادگی اور بے تکلفی ہی
کا نام ہے........!
طاہر نے خط پڑھ کر قہقہہ لگایا اور بیرنگ لفافہ کا محصول پوسٹ مین کو
دے دیا۔ پوسٹ مین محصول لیکر کھڑا رہا....
کیوں..... کھڑے کیوں ہو۔! کچھ کام ہے مجھ سے.........
طاہر نے پوسٹ مین سے کہا۔
سرکار۔! عید کا انعام........ پوسٹ مین لجاجت آمیز
انداز میں بولا۔

ارے ہاں! منشی جی! تمھارا انعام دینا تو میں بھول ہی گیا۔۔۔۔! یہ لو اپنا انعام، دو روپے تمھارے معمول کے ہیں اور ایک روپیہ تاوان کا ہے کہ میں نے وقت پر تمھیں انعام کیوں نہیں دیا اور مجھ سے بھول کیسے ہو گئی۔۔۔۔ طاہر نے پوسٹ مین کو تین روپے دیتے ہوئے کہا اور پوسٹ مین نے روپے لیتے ہوئے جھک کر سلام کیا۔ پوسٹ مین دو روپوں کی امید میں آیا تھا اور اسے ایک روپیہ زائد مل گیا۔ توقع سے بڑھکر کامیابی پر ہر کسی کو خوشی ہوتی ہے۔!

اس واقعہ کے چند دن بعد ایک اخبار میں پھر اسی خوبصورت لڑکی کی تصویر نظر آئی۔ تصویر والے صفحہ پر ایک مضمون بھی تھا جس میں لڑکی کے اخلاق اور کیرکٹر کی بہت کچھ تعریف کی گئی تھی۔ طاہر مضمون پڑھکر بہت متاثر ہوا اور اب تصویر دیکھتے وقت پسندیدگی کے علاوہ احترام کا جذبہ بھی شامل تھا، وہ تصویر دیکھتے ہوئے کہنے لگا:۔

"اتنی حسین اور صاحبِ کردار لڑکی کو منظرِ عام پر نہیں آنا چاہیئے۔ میرا بس چلے تو اس لڑکی کو چاند تاروں کی نگاہوں سے بھی چھپا دوں۔۔۔۔! اور ہاں! اسے سائیکل چلا کر شہرت حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے اس کا حُسن تو خود ہی اپنی جگہ سب کچھ ہے۔۔۔۔! اِس دُنیا میں زندگیاں کتنی غلط استعمال ہوتی ہیں۔۔۔۔!"

طاہر کا یہ استغراق بہت دیر تک رہا۔ مگر دنیا میں حسین صورتوں اور تصویروں کو دیکھکر تو کوئی جی نہیں سکتا۔ بڑے بڑے عاشق مزاج اور رنگین طبع کو بھی دنیا کے کام دھندے کرنے ہی پڑتے ہیں۔ طاہر بھی دوسرے کاموں میں لگ گیا مگر تصویر کا ایک نقش دِل و دماغ پر بہر حال اُبھر آیا تھا۔۔۔۔ اسی دل چسپی کو نوجوانوں کی اصطلاح میں "محبت" کہا جاتا ہے۔ ایسی دِل چسپیوں کے خاکے روزانہ بنتے

بگڑتے رہتے ہیں، دل چسپی بھی محبت میں شامل ہے۔ خالی دل چسپی اور صرف پسندیدگی کو محبت نہیں کہتے۔ جذبات کی شدت بعض وقت جنون میں تبدیل ہو جاتی ہی مگر یہ بھی جنون ہوس ہوتا ہے جنونِ محبت اور چیز ہے۔

طاہر کے والد کاغذ کی تجارت کرتے تھے۔ طاہر بھی کام کی دیکھ بھال کرتا تھا طاہر کو کاروبار کی ضرورت سے باہر جانا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کو اُس نے ٹیلیفون کیا تو معلوم ہُوا کہ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس کی تمام نشستیں محفوظ ہیں اور ایک ہفتہ تک جگہ نہیں مل سکتی، وہ خود اسٹیشن آیا اور بابُو سے کہا کہ مجھے کل ضرور جانا ہے۔ اگر آپ کے اسٹیشن پر کوئی مُسافر اُترا تو اُس کی جگہ میں بیٹھ جاؤنگا نہیں تو میں ٹکٹ واپس کردُوں گا، ریلوے بابُو نے اِس معقول بات کو مان لیا۔

جنگ کے زمانہ میں زنانہ اور مردانہ درجوں کا امتیاز کچھ یُوں ہی سارہ گیا ہی اچھّے اچھّے شریف لوگ پردہ نشین عورتوں کو مردانہ درجے میں لاکر بھٹاتے ہیں۔ ضرورت پابندیوں اور قیدوں کو توڑ دیتی ہے۔ طاہر ٹرین آنے سے قبل ہی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا کہ گاڑی دو گھنٹے لیٹ ہے ...... دو گھنٹے اُسے بہر حال وہاں گزارنے تھے اور اس وقت گزاری کے لئے اُسنے دیواروں پر لگے ہوئے تمام ٹائم ٹیبلوں کو پڑھ ڈالا۔ مُسافر اسکے شوق اور انہماک کو بڑے غور سے دیکھ رہے تھے کہ ایک اچھا خاصا شریف صُورت نوجوان ٹائم ٹیبلوں کے مُطالعہ میں ہمہ تن مصروف ہے ...... ! طاہر ابھی مُطالعہ ہی کر رہا تھا کہ ریل آنے کی گھنٹی بجی اور تھوڑی دیر میں ریل آگئی .... ! اتّفاق کی بات کہ سیکنڈ کلاس سے اُس اسٹیشن پر ایک مُسافر اُترا اور طاہر نے اُسکی خالی شدہ جگہ پر بڑھکر قبضہ جمالیا۔

طاہر جب سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں داخل ہوا ہے تو گھبراہٹ اس پر چھائی ہوئی تھی، کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے، ازار بند لٹکا ہوا، ایک ہاتھ میں اخبار اور دوسرے میں ٹکٹ اور ریزگاری...... ! قلی نے اندر آکر سامان رکھا ہی تھا کہ طاہر گھبرا کر بولا۔

"ارے ہمیرا لوٹا تو ویٹنگ روم ہی میں رہ گیا...... اور ہاں ! دیکھنا شاید اپنی عینک کا گھر بھی وہیں بھول آیا ہوں..... !"

قلی سامان رکھ کر دوڑا اور طاہر کا لوٹا لاتے ہوئے بولا:-

"حضور ! آپ کی عینک کا گھر وہاں نہیں ہے..... !"

طاہر نے جیب ٹٹولتے ہوئے جواب دیا..." مل گیا.... مل گیا..."

تھوڑی دیر تک تو طاہر پر بدحواسی طاری رہی اور اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد جو اس نے سامنے کی سیٹ پر نگاہ کی تو اس کی حیرت اور خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ وہی خوبصورت لڑکی جس کی تصویر اس نے رسالوں اور اخباروں میں دیکھی تھی سامنے سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی..... ! اصل سچ مچ نقل سے زیادہ حسین اور دلکش تھی، حسین عورتوں کے چہروں پر بھپن اور جاذبیت تو ہوا ہی کرتی ہے، مگر اس لڑکی کے چہرے میں کشش تھی کہ نگاہیں خود بخود کھنچی چلی جاتی تھیں۔ لڑکی کے دونوں رخسار کے ابھار پر تل تھے، اس چھپنر نے چہرے کو جاذبیت کا مرکز بنا دیا تھا۔ دیکھنے والوں کی آنکھوں کی پتلیاں رخسار کے خالِ سیاہ میں جذب ہوئی جاتی تھیں.... !

لڑکی بہت بے تکلفی کے ساتھ سیٹ پر لیٹی ہوئی تھی سینہ کے دو بٹن کھلے ہوئے تھے اور خوب طاقت کے ساتھ انگڑائی لیتے وقت تو یہ عریانی اور زیادہ نمایاں ہو گئی..... ! کھلی ہوئی باہیں، نیم عریاں پنڈلیاں اور گردن کے نیچے کا حصہ بالکل

برہنہ ..... !حسن، جوانی، دلکشی ...... !بہت سی قیامتیں ایک جگہ جمع ہو گئی
تھیں .... !طاہر نے لڑکی کو بہت زیادہ غور سے دیکھا وہ اپنے حافظہ کی مدد سے
اس بات کا اطمینان کر رہا تھا کہ جس لڑکی کا فوٹو دیکھا تھا یہ وہی لڑکی ہے .... !
لڑکی نے طاہر کے اس طرح گھور کر دیکھنے کو گوارا کر لیا بلکہ اسکے تیوروں
سے خوشی کے آثار جھلک رہے تھے کہ ہمارے حسن کی داد دی جا رہی ہے۔ طاہر
فطری طور پر شرمیلا تھا اور ایک غیر عورت سے اس طرح ایکا ایکی بات چیت
کرنا بھی خلاف تہذیب ہے۔ وہ خاموش بیٹھا رہا۔ لڑکی طاہر کی ایک ایک
حرکت کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی گویا کہ کچھ نہیں دیکھا حالانکہ سب کچھ
دیکھ لیا اور معلوم کر لیا۔ طاہر نے کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکایا اور جیب سے چاندی کا
سگرٹ کیس نکال کر سگرٹ پینے لگا۔ دو تین کش لگانے کے بعد طاہر بہت دیر تک
کچھ سوچتا رہا۔ سگرٹ اتنے میں بجھ گئی، اُس نے دیا سلائی کھینچکر سگرٹ سلگائی اور
بالکل بے خیالی کے عالم میں دیا سلائی سامنے کی طرف پھینک دی۔ دیا سلائی
جل رہی تھی۔ لڑکی کی خاکی قمیص پر دیا سلائی گری اور وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی ......
دُنیا میں بڑا بڑا عقلمند پڑا ہوا ہے، لوگوں کو آنکھیں رکھتے ہوئے نظر
نہیں آتا .... لڑکی آگ بجھاتے ہوئے بولی۔
یہ آپ کس سے کہہ رہی ہیں ...... آخر ہوا کیا ــــ طاہر نے جواب دیا۔
صاحب! آپ سے کہہ رہی ہوں آپ سے ..... !آپ نے جلتی ہوئی
دیا سلائی میرے اوپر پھینک دی، میری قمیص جل گئی اور وہ تو خیر ہوئی کہ میں
نے دیکھ لیا نہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ...... !اتنا کچھ ہونے پر بھی آپ

652 marks. 28-2-54.

اطمینان سے بیٹھے ہیں ـــــــ لڑکی نے قمیص کا آتش زدہ حصہ چھُوتے ہوئے کہا۔

صاحب! معاف فرمائیے.... !خدا کے لئے معاف کر دیجئے، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں اپنے قصور کی معافی چاہتا ہُوں۔ بعض وقت میں بدحواس سا ہو جاتا ہوں یہ میری ہمیشہ کی عادت ہے ـــــــ طاہر نے پشیمان ہو کر جواب دیا۔

لڑکی اس جواب پر بے اختیار مسکرا دی، طاہر کے لئے اس مسکراہٹ میں سب کچھ تھا۔

ایک بات آپ سے دریافت کر سکتا ہوں ـ طاہر نے لڑکی سے کہا۔

جی ہاں۔ !فرمائیے تو سہی۔ ؟ ـــــــ لڑکی نے جواب دیا۔

آپ سائیکل بھی چلاتی ہیں ـــــــ طاہر نے دریافت کیا۔

اِس زمانہ میں کونسی پڑھی لکھی لڑکی سائیکل نہیں چلاتی لڑکی مُسکرا کر بولی۔

آپ میرا مطلب نہیں سمجھیں ـــ !میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں آپ ہی کو سائیکل کی دوڑ میں اوّل انعام ملا تھا ـــــــ طاہر نے بالوں میں گرہ لگاتے ہوئے پوچھا

آپ کو کیسے معلوم ہوا ـــــــ لڑکی نے دلرُبایانہ انداز میں جواب دیا۔

آپ کی تصویریں میری نگاہ سے گذری ہیں ـــــــ طاہر نے کہا۔

تو کیا ایک صُورت کے متعدد انسان نہیں ہوتے ـــ لڑکی جماہی لیتے ہوئے بولی

مگر وہ تصویر تو ہو بہو آپ ہی کی تھی ـــــــ طاہر نے دریافت کیا۔

لڑکی نے اس جواب میں مسکرا کر سر ہلایا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس کے صبیح رخساروں کے تِل طاہر پر مسمریزم کا عمل کر رہے تھے۔

اب آپس میں خوب گھل مل کر باتیں ہونے لگیں، طاہر نے دریافت کیا کہ سائیکل

چلانے میں اتنا کمال آپ نے کیسے پیدا کیا تو اس کے جواب میں لڑکی نے ایک طویل داستان سُنا دی۔ لڑکی نے کہا کہ اسی سائیکل کی بدولت ایک دفعہ میں مرتے مرتے بچی، ہوا یہ کہ میں اپنے بنگلہ کے سامنے کے میدان میں سائیکل کی مشق کر رہی تھی اس میدان کے قریب ہی ایک نالہ تھا اور نالہ سڑک سے ملا ہوا تھا۔ تانگہ کا ایک گھوڑا رسے تڑا کر بھاگا آ رہا تھا اُس نے چھلانگ مار کر نالہ پار کیا میں اس کی ٹاپوں کے بالکل محاذ میں تھی۔ میں نے سائیکل اس قدر تیزی کے ساتھ موڑی کہ بیلنس قائم نہ رہا اور میں نالی میں گر پڑی بس اتنا تو مجھے ہوش ہے کہ ایک گھوڑا میدان میں بھاگتا ہوا آیا میں سائیکل سمیت نالی میں گر پڑی اس کے بعد کیا ہوا مجھے خبر نہیں، دوسرے دن صبح کو جب مجھے ہوش آیا ہے تو میں ہسپتال میں تھی۔ اور تو زخموں کے تمام نشانات جاتے رہے۔ بس یہ ایک نشان باقی رہ گیا ہے۔ لڑکی نے یہ کہتے ہوئے اپنی قمیص کو نہایت بے تکلفی کے ساتھ اوپر کو اٹھا دیا، چوٹ کا نشان خوب نمایاں تھا مگر یہ نشان کہاں تھا۔ ؟ ناف سے کچھ اوپر اور ......! طاہر کی نگاہوں پر تو خیر گی طاری ہو گئی وہ ہتھیلیوں سے آنکھیں ملنے لگا۔ ان مناظر کی تو کوئی بوڑھا آدمی بھی تاب نہیں لا سکتا اور طاہر تو جوان نہیں نوجوان تھا جسکی مسیں ابھی کچھ دن پہلے بھیگی تھیں اور جسکے جذبات کی آگ پر پہلی مرتبہ تیل چھڑکا گیا تھا۔

راستے بھر باتیں ہوتی رہیں، لڑکی اچھی طرح سمجھ گئی کہ نوجوان اس سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اور آج کل کی تہذیب زدہ لڑکیاں مردوں کی اس دلچسپی کو اپنے حُسن کی کامیابی سمجھتی ہیں۔ قدردان اور ہوس آمیز نگاہوں کو دیکھ کر ان کے چہرے پر شرم کی

نہیں مسرت کی سرخی جھلکنے لگتی ہے اور اسی سرخی سے بہت سے رنگین واقعات کے خاکے تیار ہوتے ہیں۔

باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو حال معلوم ہوگیا کہ وہ دونوں ایک ہی جگہ جا رہے ہیں، لڑکی نے کہا میرے چچا زاد بھائی ڈالٹن گنج میں رہتے ہیں۔ میں ان کے یہاں جا رہی ہوں۔ جنکشن آنے سے کچھ قبل لڑکی غسلخانہ میں گئی اور اب جو وہ وہاں سے نکلی ہے تو اس کے لباس اور صورت کے زمین و آسمان ہی بدلے ہوئے تھے۔ ڈبے میں وہ قریب قریب شب خوابی کے لباس میں تھی اور اب ...... ! خوشنما ساری، کانوں میں ہیرے کے آویزے جھم جھم کرتے ہوئے، رخساروں کے اُبھار پر ہلکی سی سرخی، ہونٹوں پر لپ اسٹک کی دھڑی جمی ہوئی، تنگ بلاؤز کو اس نے اس انداز میں پہنا تھا کہ کوئی نہ دیکھتا ہو تو دیکھنے لگے ...... !

طاہر نے لڑکی سے متعدد سوالات کیے مگر اس نے ایک آدھ سوال کا جواب کچھ ادھ کٹے لفظوں میں دیا، لڑکی کے انداز سے پتہ چلتا تھا کہ اسٹیشن آنے سے پہلے ہی وہ طاہر سے انجان اور ناواقف بنجانا چاہتی تھی، ڈبہ کی عارضی دلچسپی ختم ہوگئی اور اب کسی طویل دلچسپی کا انتظار ہے۔ طاہر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یا تو وہ بے تکلفی کا عالم تھا کہ لڑکی نے اپنا پیٹ کھول کر دکھا دیا اور اب یہ حالت ہو کہ بات کا جواب دینے میں بھی اسے تکلف محسوس ہوتا ہو۔ جنکشن آیا، ٹرین رُکی، لڑکی نے ایک نوجوان کو پلیٹ فارم پر دیکھکر رومال ہلایا۔ نوجوان بھاگ کر وہاں آیا، لڑکی ٹرین سے اُتری، بڑی گرمجوشی کے ساتھ دونوں نے ایک دوسرے کے

ہاتھ کو جھٹکا دیا، طاہر کی طرف لڑکی نے مڑ کر بھی نہ دیکھا یہ بیچارہ اسی انتظار میں
رہا کہ چلتے وقت ہی شاید کچھ اشارہ ہو جائے ....!

طاہر ٹرین سے اتر کر ہوٹل چلا آیا اور وہاں کئی دن تک ٹھیرا رہا۔ ایک ہفتہ
بعد اسے واپس چلا جانا چاہیئے تھا مگر اسکے باپ کا تار آیا کہ مال بھیجا جا رہا ہے، اس
کے آنے تک ٹھیرے رہو۔ طاہر کو وہاں رُک جانا پڑا۔ طاہر کی دلچسپیاں محدود
تھیں سینما دیکھ لیا، کسی جاننے والے کے ساتھ کلب گھر چلا گیا، اخبار پڑھے، دریا
کے کنارے کی سیر کی اور سو گیا۔ طاہر ایک دن شام کو ہوٹل کے سبزہ زار میں
بیٹھا ہوا چائے پی رہا تھا۔ سبزہ زار میں لکڑیوں کے تختے لگا کر گاہکوں کے لئے
چھوٹے چھوٹے کمرے بنا دئے گئے تھے، ان نشستگاہوں کی چھت کھلی ہوئی
تھی درمیان میں بس لکڑیوں کے تختے حائل تھے اور ایک نشست کی بات
چیت دوسری نشست میں اچھی طرح سنی جا سکتی تھی۔!

طاہر نے سنا کہ قریب کی نشست سے مرد اور عورت کی بات چیت کی آواز
آواز آرہی ہے۔ لڑکی کہہ رہی تھی کہ آپ مجھے تباہ کر کے اب دامن چھڑانا چاہتے ہیں۔
آپ نے شادی کا وعدہ کیا تھا، اُس وعدے کی تکمیل کیوں نہیں کی جاتی اور آپ
پہلے تو میرے لئے جان دیتے تھے کہا جاتا تھا کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں
رہ سکتا اور اب یہ عالم ہے کہ ایک ایک ہفتہ ملاقات کی نوبت نہیں آتی، مرد نے
جواب دیا کہ میں نے شادی کا کبھی وعدہ نہیں کیا، تم نے کئی مرتبہ آپ ہی شادی
کا ذکر نکالا، مگر میں اسپر خاموش ہو گیا، تم نے میری اس خاموشی کو غالباً "نیم رضا"
سمجھ لیا، لیکن خاموشی کا مطلب انکار بھی تو ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ سننے والا کسی

مصلحت کے سبب صاف انکار کرنا نہیں چاہتا۔ طاہر چائے پیتے ہوئے دونوں کی باتیں سُنتا رہا، تھوڑی دیر بعد طاہر وہاں سے اُٹھ کر باہر آیا اور وہ دونوں بھی سبزہ زار کی نشست سے باہر آکر صحن میں ٹہلنے لگے۔ طاہر نے دیکھا کہ وہی لڑکی جس کا ٹرین میں ساتھ ہوا تھا اُسی نوجوان کے ساتھ جو اُسے جنکشن پر لینے کے لیئے آیا تھا ٹہل رہی ہے۔ نوجوان کسی کام سے ہوٹل کی عمارت میں گیا اور طاہر نے آگے بڑھتے ہوئے لڑکی سے کہا:-

ارے آپ یہاں کیسے -؟

لڑکی نے چونک کر جواب دیا:-

میں اپنے بھائی کے ساتھ چائے پینے کے لئے آئی تھی -!

طاہر نے مُسکرا کر کہا:-

یہ آپ کے بھائی آپ سے شادی کرنے پر رضا مند کیوں نہیں ہوتے؟

لڑکی نے جھنجلا کر جواب دیا:-

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ دماغ تو صحیح ہے آپ کا -!

طاہر زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بولا:-

میرا دماغ تو صحیح ہے۔ دماغ تو اُن لڑکیوں کا خراب ہوتا ہی جو اپنا سب کچھ تباہ کر کے مردوں کے آگے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ خدا کے لئے ہم سے شادی کرلو اور مرد اُن کی اس التجا کو ٹھکرا دیتے ہیں.....! آپ پریشان نہ ہوں میں نے سب کچھ سُن لیا ہی، میں آپ کے قریب کی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اور مجھے......!

طاہر کی بات پوری ہونے سے پہلے نوجوان صحن کی طرف آتا ہوا دکھائی

دیا اور لڑکی دروازے کی طرف تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے چلی گئی۔!

طاہر اپنے کام سے فارغ ہو کر مکان چلا آیا اور طمینان کے ساتھ اپنا کام کرنے لگا مگر اس کی بدحواسی کچھ کم تو ہو گئی تھی پورے طور پر گئی نہ تھی۔ ایک مرتبہ اُسنے اپنے آفس میں سگرٹ سلگا کر جلتی ہوئی دیا سلائی کاغذوں پر پھینکدی اور کاغذوں میں آگ لگ گئی، وہ تو یہ خیر ہوئی کہ پانی کی صراحیاں رکھی تھیں، نوکروں نے صُراحیوں کا پانی ڈال کر آگ پر بہت جلد قابو پا لیا نہیں تو طاہر کے والد شیخ صاحب کا لاکھوں روپیہ کا کاغذ جلکر راکھ ہو جاتا..... ! اپنی اِس بدحواسی پر طاہر نے مسکرا کر کہا:۔

ارے! ایک مرتبہ اور مجھ سے ایسی ہی حماقت سرزد ہو چکی ہی، ایک لڑکی کے اُوپر میں نے جلتی ہوئی دیا سلائی پھینک دی۔ اپنی غلطی پر اُسوقت تو مجھے پشیمانی ہوئی، مگر اب میں مطمئن ہوں اس قسم کی لڑکیاں ہندوستان کی پیشانی کا سب سے زیادہ مکروہ داغ ہیں۔!

طاہر اپنے آفس میں بیٹھا ہوا حساب کی جانچ پرتال کر رہا تھا اس کا ایک دوست آیا اور کہنے لگا کہ بھئی طاہر تم اپنے کاروبار میں ایسے پھنسے ہو کہ دوست احباب سے ملنا چھوڑ دیا، کیا اس تجارت کے پیچھے لوگوں سے تعلقات ختم کر دوگے۔ ہمارے یہاں کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس جن سے تمھاری اچھی طرح جان پہچان ہی شادی کر کے دُلہن کو لے آئے ہیں اُن کی طرف سے کئی دعوتیں ہوئیں، مگر تم نے ایک دعوت میں بھی شرکت نہیں کی۔ ڈپٹی صاحب شکایت کر رہے تھے کہ طاہر ہمارے یہاں نہیں آئے۔ آج محکمہ آبکاری کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طرف سے دعوت ہی۔ تمھارے نام دعوتی کارڈ آچکا ہے تمھیں اس

دعوت میں ضرور چلنا ہوگا ڈپٹی صاحب سے وہاں مُلاقات ہوجائیگی اور تمھیں شکایت دور کرنے کا موقعہ ملجائے گا۔

اور.... ہاں! طاہر...! ڈپٹی صاحب کی بیوی جتنی زیادہ حسین ہیں اس سے زیادہ شرمیلی اور باحیا ہیں؟ مجال ہی جو انکے سر سے ساری کا پلّو تو ہٹ جائے۔ لوگوں کے مجمع میں آنکھیں نیچی کیئے رہتی ہیں، ڈپٹی صاحب بڑے خوش نصیب ہیں کہ انکو اتنی حسین اور اتنے اچھے کیرکٹر کی بیوی ملگئی ورنہ اس زمانہ میں تو کنواری لڑکیاں مردوں کے شانے سے ٹکراتی ہوئی چلتی ہیں۔

طاہر اپنے دوست کیساتھ پارٹی میں گیا۔ بنگلہ کے خوشنما چمن میں دعوت کا انتظام تھا۔ سب لوگ کھا پی رہے تھے، طاہر نے دیکھا کہ فوارے کے قریب کی میز پر ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب اپنی دلہن کیساتھ بیٹھے ہوئے ہیں۔ دُلہن کی گردن میں پھولوں کے ہار ہیں اور وہ بہت ہی لجائی ہوئی اور سمٹی ہوئی، نگاہیں نیچی کیئے ہوئے بیٹھی ہی۔ طاہر نے ڈپٹی صاحب کو جاکر مبارکباد دی اور ڈپٹی صاحب نے طاہر کا ہاتھ پکڑکر وہیں بٹھالیا اور اپنی بیوی سے تعارف کرایا۔ طاہر نے دلہن کو اور دلہن نے طاہر کو دیکھا، دُلہن کی نگاہیں اور نیچی ہوگئیں اور طاہر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آتے آتے رہ گئی، یہ وہی لڑکی تھی جو ایک مرتبہ ریل میں اسکی ہم سفر رہی تھی اور ہوٹل میں ایک نوجوان کیساتھ اسے دیکھا گیا تھا اور راز کی باتیں سُنی گئی تھیں۔!

ڈپٹی صاحب کرسی سے اُٹھکر کسی کے استقبال کے لئے گئے اور دُلہن نے طاہر کو غور سے دیکھا، دُلہن کی نگاہوں میں پشیمانی اور التجا جھلک رہی تھی، طاہر نے آہستہ سے کہا:۔

"تم مطمئن رہو میں کم ظرف نہیں ہوں۔ تمھارا راز ہمیشہ راز رہے گا۔"

دُلہن نے گردن کو ہلکی سی جنبش دی شکریہ ادا کرنے کے لئے۔! اور بینڈ بجنے لگا۔

گمشدہ خط

چار پاجامے، چار قمیصیں، دو شیروانیاں، تین تکیے کے غلاف اور ایک پلنگ کی چادر۔ یہ کل چودہ کپڑے ہوئے فیروز نے پھٹی ہوئی کاپی پر پنسل سے میزان لگاتے ہوئے کہا۔

میاں! یہ آپ کی چادر کا کونا جلا ہوا ہے؟ ذرا اس کا خیال رہے دھوبی چادر میں کپڑے باندھتے ہوئے بولا۔

یہ ہمارے مہربان اور بے تکلف دوستوں کی مہربانی کی نشانی بلکہ یادگار ہے! تم چادر کو ذرا سنبھال کر دھونا، ایسا نہ ہو کہ پہلے شوب میں ہی چادر تار تار ہو جائے۔ جلا ہوا کپڑا پھٹے ہوئے کپڑے سے زیادہ احتیاط چاہتا ہے فیروز نے دھوبی سے کہا۔

میں آپ کی چادر کو اپنے ہاتھ سے دھوؤں گا، آپ اطمینان رکھیے۔ کپڑے کا ایک تار بھی ادھر سے ادھر نہیں ہو سکتا دھوبی نے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

اچھا یہ تو بتاؤ۔! کپڑے لاؤ گے کب.... ؟ فیروز نے دریافت کیا۔

میاں ! آج (سوچتے ہوئے) ایشور آپ کا بھلا کرے.... انوار ہی! انوار اور انوار آٹھ دن ہوتے ہے۔ ! پیر کو صاحب لوگوں کا بڑا دن ہی۔ ! منگل کو آپ کے کپڑے آجائیں گے۔ دھوبی نے جواب دیا۔

منگل کو کپڑے آئیں گے۔ ؟ خوب ! آج سے دس دن بعد۔ ! اور میرے پاس دُھلے ہوئے کپڑے دو جوڑی رہ گئے ہیں۔ ؟ تو تم یہ چاہتے ہو کہ یا تو میں میلے کپڑے پہنے ہوئے شہر میں پھروُں یا پھر شرم کے مارے دروازہ بند کرکے مکان میں بیٹھا رہوں۔ فیروز نے دھوبی کی طرف خوب غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

میاں ! آجکل کام بہت ہے، میں اور میرے گھر والے دن رات کام میں لگے رہتے ہیں پھر بھی کام نہیں نبٹ پاتا۔ ! گورہ پلٹن کا کام بھی مجھے مل گیا ہے۔ ایشور کی کرپا سے آمدنی بہت کچھ ہے مگر ایک گھڑی کے لئے بھی چین نہیں ملتا، جب میرے پاس پیسہ نہیں تھا تو چین تھا اور اب پیسہ ہے تو چین نہیں رہا دھوبی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا

کھوانی۔ ! تو نے سچ کہا دھن دولت کے آتے ہی چین رخصت ہو جاتا ہے۔ لوگ اپنی نادانی سے سونے چاندی کے ڈھیروں میں سکوُن و اطمینان تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ؟ حالانکہ دولت سکون و آرام کی دشمن ہے۔ ! اچھا کھوانی ! دیکھو زیادہ سے زیادہ سنیچر تک میرے کپڑے آجانے چاہئیں، اگر تمھیں فرصت نہ ہو اور جب تک کپڑے نہ دے سکو تو بھیا مجھسے صفائی کے ساتھ کہہ دو، میں فیکٹری میں اپنے کپڑے دے

دوں گا ! فیروزؔ نے کہا۔

میاں ! آپ اطمینان رکھیں سنیچر سے ایک دن پہلے آپ کے کپڑے آجائیں گے دھوبی کہتا ہوا باہر چلا گیا اور فیروز میز پر رکھے ہوئے لیمپ کو صاف کرنے لگا !

فیروزؔ نے لیمپ کی چمنی کپڑے سے صاف کی، بتّی کو قینچی سے کاٹ کر درست کیا، جلے ہوئے پتنگوں کو کاغذ میں جمع کرتے ہوئے وہ خود کو مخاطب کرکے کہنے لگا:۔

یہ پتنگے بھی عجیب بیوقوف اور سرپھرے ہیں کہ لیمپ کی چمنی سے ٹکرا ٹکرا کر مرجاتے ہیں۔ اس لیمپ نے ہزاروں ننھی اور معصوم جانوں کا ایک رات میں خون کیا ہی ! اس پر بھی شاعر کہتا ہے:۔

شمع نے آگ رکھی سر پہ قسم کھانے کو

بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

ان شاعروں کو بھی زمین آسمان کے قلابے ملانے اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے میں مزہ آتا ہی، انہی شاعروں نے لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کردیا ہی کہ قمری سرو پر، بلبل گلاب پر، چکور چاند پر اور پروانہ شمع پر عاشق ہی۔ ! میں یہ کہتا ہوں کہ پروانہ اگر سچ مچ شمع کا شیدائی ہے تو پھر دن میں جلتی ہوئی شمع پر آکر جان نچھاور کیوں نہیں کرتا، اس کا جذبہ عشق رات میں ہی کیوں بیدار ہوتا ہی۔؟ یہ کیسی آتش محبّت ہے جو طلوعِ آفتاب سے لیکر غروبِ آفتاب تک خاموش رہتی ہی اور سورج کے چھپتے ہی بھڑک اٹھتی ہے ؟ محبّت تو وقت فضا اور ماحول کی پابند نہیں ہوتی؟

فیروز انہی متکلم خیالات میں غرق تھا کہ اس کے مکان کے قریب کے دروازے پر پوسٹ مین نے آکر آواز دی۔

خط لے جاؤ۔

اس آواز کو سُنکر فیروز بے اختیار چونکا جیسے کوئی بھُولی ہوئی چیز یاد آگئی وہ گھبرا کر اُٹھا اور پلنگ کے سرہانے رکھے ہوئے کاغذوں کو دیکھا !

خط نہیں ہے ...... ؟ اُس نے مایوسانہ لہجے میں زور سے کہا اور میز کی دراز کھول کر کھویا ہوا خط تلاش کرنے لگا۔ اس نے میز کی تمام چیزوں کو گھبراہٹ میں تتّر بتّر کر دیا۔ گھبراہٹ کی تلاش اور بدحواسانہ جستجو میں یہی ہوتا ہے کہ جن چیزوں میں کھوئی ہوئی چیز کو تلاش کیا جاتا ہے تو وہ چیزیں بالکل منتشر اور غیر مرتّب ہو جاتی ہیں۔ ! بدحواسی ترتیب اور قرینے کی دشمن ہے۔ ! فیروز کی بدحواسی نے کمرے کی چیزوں کو اس قدر بے ترتیب کر دیا تھا کہ جیسے پولیس نے اس کمرے کی ابھی ابھی تلاشی لی ہے۔

سعی و جستجو کی ناکامی نے فیروز کی طبیعت میں جھنجلاہٹ پیدا کر دی تھی وہ ہوا، پانی اور در و دیوار سے دست و گریباں ہونے کے لئے تیار تھا۔ دالان کی کھُنٹی پر کوّے نے کائیں کی اور اس پر فیروز نے بڑبڑانا شروع کیا۔

لوگ کہتے ہیں خدا نے کوئی چیز بیکار اور رائیگاں پیدا نہیں کی !
میں کہتا ہوں کہ یہ چیل کوّے آخر کیوں پیدا کئے گئے ہیں۔ ان کی تخلیق اور ایجاد میں آخر کونسی گہری مصلحت پوشیدہ ہو، ارے صاحب! قدرت نے انسانوں کے سروں پر چیل کوّے مسلط کر دئے ہیں، یہ قدرت کا مذاق ہے یا انتقام ؟ اگر مذاق ہو

تو پھر اللہ میاں کو بندوں سے مذاق نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ شانِ خداوندی کی عظمت کے منافی ہے۔ اور اگر انتقام ہے تو پھر کہنا پڑے گا کہ قدرت نے انسان کو زندگی دے کر اس غریب پر ظلم کیا ہے۔ یہاں ایک ایک سانس پر احتساب کیا جاتا ہے قدرت نے قمری، فاختہ، بلبل اور مور کو پیدا کیا تو اچھا کیا کہ ان خوبصورت پرندوں کو دیکھ کر آنکھیں لطف حاصل کرتی ہیں اور ان کے نغمے کانوں کو بھلے لگتے ہیں، لیکن اس کالے کلوٹے کوّے کی تخلیق تو "دوزخِ نگاہ" اور "جہنمِ گوش" کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔؟

فیروز پھر سوچنے لگا، خط کمرے ہی میں ہونا چاہیئے۔! مگر میں نے کمرے کی ایک ایک چیز تلاش کر لی خط ہوتا تو مل جاتا۔ وہ پھر گہرے سوچ میں ڈوب گیا اس کا دماغ حافظے کے اوراق ایک ایک کر کے الٹنے لگا۔

میں نے کل شام وہ خط شیروانی کی جیب میں رکھ دیا تھا وہ کپڑوں کی الماری کی طرف زور سے کہتے ہوئے بڑھا۔! الماری کا دروازہ کھولتے ہی وہ رُک گیا اور پھر بولا:۔

میں نے وہ شیروانی تو آج دھوبی کو دُھلنے کے لئے دیدی۔

فیروز چپل پہنے ہوئے گلی کے نکڑ پر آیا اور لوگوں سے دھوبی کے متعلق پوچھنے لگا، دھوبی کو گئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ خط کے بعد دھوبی کے ڈھونڈنے کی کوشش بھی ناکام ہوئی! وہ دھوبی کے نام سے تو واقف تھا مگر دھوبی کہاں رہتا ہے؟ یہ معلوم کرنے کی اُس نے کبھی کوشش ہی نہیں کی؟ مگر آج دھوبی کی رہائش گاہ معلوم کرنے کی شدید ضرورت پیش آگئی تھی۔ فیروز

نے ایک ایک سے دھوبی کا پتہ پوچھا۔ شہر کے دھوبیوں میں اپنے دھوبی کی تلاش کی اور وہ جو کسی نے کہا ہے کہ آدمی ڈھونڈھنے پر آجائے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ رات میں دس گیارہ بجے بہت کچھ خاک چھاننے اور پوچھ گچھ کے بعد پتہ لگا کہ کھوائی دھوبی شہر سے پانچ میل دُور ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ فیروز نے گاؤں کی سمت اور محلِ وقوع کے بارے میں خاطر خواہ معلومات حاصل کرلیں!

فیروز دن بھر کا تھکا ہوا تھا اور تھکا ہوا آدمی پلک جھپکاتے ہی سو جاتا ہے۔ مگر فیروز کے دل و دماغ پر خط کا تصور مستولی تھا۔ نیند سکون اور اطمینان کی حالت میں آتی ہے اور یہاں خط کے کھو جانے سے خیالات میں نہیں حواس میں انتشار پیدا ہو چلا تھا۔ وہ صبح کے انتظار میں رات بھر کروٹیں بدلتا رہا۔ انتظار کی گھڑیاں بہت زیادہ سُست رفتار ہوتی ہیں۔ فیروز جھنجلا رہا تھا کہ آج کی رات اتنی لمبی کیوں ہو گئی ہے کہ صبح نہیں ہو پاتی۔ وہ حسین و معصوم تاروں کو غصہ کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ہوا کے سرد جھونکے اسے ناگوار محسوس ہو رہے تھے اس کی بیتاب نگاہیں طلوعِ سحر اور نمودِ آفتاب کے انتظار میں تھیں۔

شدّتِ انتظار سے گھبرا کر اُس نے شعر گنگنانا شروع کیے، اشعار سے تھوڑا بہت دِل تو بہل جاتا ہے مگر وقت کی رفتار میں ذرا سی بھی تیزی پیدا نہیں ہوتی، شعر پڑھتے پڑھتے جب طبیعت سیر ہو گئی تو اُس نے کتاب اٹھالی انتظار کے عالم میں مطالعہ تو کیا ہوتا ہاں! ورق گردانی کا امکان تھا سو فیروز کتاب کے ورق اُلٹنے لگا۔! دس بیس ورق اُلٹتا اور گھڑی کو دیکھتا۔ کئی بار اُسے شبہ ہوا کہ گھڑی بند ہو گئی ہے مگر ہر بار اس کا شبہ غلط ثابت ہوا گھڑی

بدستور چل رہی تھی لیکن گھڑی کی باضابطہ اور مقررہ رفتار فیروز کی بیتابی کا ساتھ
نہیں دے سکتی تھی۔!

فیروز کروٹیں ہی بدل رہا تھا کہ تارے جھلملانے لگے اور صبح کاذب کے
آثار نمودار ہو گئے، وہ گھبرا کر اُٹھا، مُنہ دھویا۔ !مگر کس طرح؟ ایک ہی چلّو پانی
میں ہاتھ بھی دھو لیئے اور کلّی بھی کی، مُنہ پر پانی کے دو چار چھپکے مارے، کُرتہ
کے دامن سے مُنہ صاف کیا، شیروانی پہنی اور سائیکل لیکر گھر سے روانہ ہو گیا
جُھٹ پُٹے کا وقت تھا، پُورے طور پہ صبح نہیں ہوئی تھی، پرند اپنے
آشیانوں میں پر پھٹ پھٹا رہے تھے، شہر کی گلیاں ابھی تک سنسان تھیں، کام
کاج کرنے والے جہاں تہاں آتے جاتے دکھائی دیتے تھے۔ فیروز گاؤں کی
طرف تیز تیز روانہ ہوا، اتفاق سے ہوا بھی موافق تھی اور اگر ہوا مخالف بھی ہوتی
تو فیروز کی بیتابی سائیکل کو بہر صُورت صبا رفتار بنا کر چھوڑتی، وہ دو ڈھائی میل
پکّی سڑک پر سائیکل چلاتا رہا اس کے بعد کچّا راستہ آ گیا۔ جنگلوں کے راستے یوں
بھی ناہموار ہوتے ہیں اور جس گاؤں کا فیروز نے عزم کیا تھا اُس کا راستہ تو
مسلسل نشیب و فراز اور پیہم پیچ و خم کے سوا اور کچھ تھا ہی نہیں۔! قدم قدم پر
پڑتا تھا۔ سائیکل کے پہیے لچکے جا رہے تھے۔ سرکس والے شاید اسی قِ
کے دشوار گزار اور پیچیدہ راستوں میں مشق کرتے ہوں گے۔ کوئی اناڑی اور
نوسیکھ سائیکل سوار تو ایسے راستہ میں سائیکل چلا ہی نہیں سکتا۔ فیروز کو کئی جگہ
سائیکل سے بادلِ ناخواستہ اُترنا پڑا، مگر جہاں ذرا سی مسطح اور ہموار زمین نظر آئی
اور وہ پھر سائیکل پہ سوار ہو گیا وہ جلد سے جلد دھوبی کے یہاں پہونچ جانا چاہتا

تھا۔ شوق اور جستجو منزل کی دشواریوں پر قابو پا سکتی ہے مگر راہ کے نشیب فراز کو ہموار نہیں بنا سکتی۔! ایک موڑ پر فیروز کی سائیکل کا پہیہ پھٹ گیا۔ اسے سائیکل سے نیچے اُتر جانا پڑا، ٹایر کا ایک حصہ عاشق کے چاک گریباں کی طرح پرُزے پرُزے ہو گیا تھا۔ پیدل چلنے کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا۔ فیروز سائیکل کو تھامے ہوئے پیدل چلنے لگا، تھوڑی دُور چلنے کے بعد دوراہہ آیا جہاں سے دو راستے پھٹے تھے۔ فیروز دوراہے پر کھڑا ہو کر سوچنے لگا کہ کونسے راستہ پر جانا چاہیئے۔ راستہ کا غلط انتخاب اُس کے عزم و مقصد کے لئے بہ ہر نوع تباہ کن نہیں تو مضر ضرور تھا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پیچھے سے ایک راہگیر آتا ہوا دکھائی دیا، فیروز کی تمناؤں میں جان پڑ گئی۔ گاؤں کا لمبا تڑنگا آدمی ڈگیں بھرتا ہوا آن کی آن میں فیروز کے پاس آ گیا۔

کنور پور کو کونسا راستہ جاتا ہے ——— فیروز نے گاؤں والے سے دریافت کیا

یہ آپ کے اُلٹے ہاتھ کا راستہ سیدھا کنور پور کو جاتا ہے، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔ کنور پور میں ہی میرا گھر ہے ——— گاؤں والے نے جواب دیا۔

فیروز گاؤں والے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا فیروز کے لئے تو وہ گنوار خضرِ راہ ثابت ہوا۔

کنور پور میں آپ خانصاحب کے یہاں جائینگے ——— گاؤں والے نے پوچھا۔

نہیں بھئی! میں خانصاحب وانصاحب کو نہیں جانتا، مجھے تو تمہارے گاؤں کے کھوانی دھوبی سے ایک ضروری کام ہے اس کے پاس جا رہا ہوں۔ فیروز سائیکل اُٹھاتے ہوئے بولا۔

تو آپ اپنے کل کے گھوڑے پر کیوں نہیں بیٹھ جاتے ——— گاؤں والے نے کہا۔

اِس کا پہیہ خراب ہو گیا ہے ——— فیروز نے جواب دیا۔

یہ وہی مثل ہوئی کہ کبھی ناؤ گاڑی پر اور کبھی گاڑی ناؤ پر۔ ! بابوجی — ! بُرا نہ مانئے آدمیوں نے کیسی کیسی سواریاں نکالدی ہیں کہ بیلوں اور گھوڑوں کے بنا ہی اُڑی اُڑی پھرتی ہیں مگر پھر بھی ہاتھ پیروں کے بغیر آدمی کا کام نہیں چل سکتا، ایشور کی پیدا کی ہوئی چیزوں اور آدمی کی بنائی ہوئی چیزوں میں زمین آسمان کا فرق ہے ——— گاؤں والا بولا۔

ہاں بھئی ! تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں تمھارے کہے ہوئے پر اور اتنا اضافہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ان طرح طرح کی مشینوں اور کل پُرزوں نے آدمی کو اپاہج سا بنا دیا ہے۔ اگر سائنس کی ایجادات کی یہی رفتار رہی تو اس دُنیا کے عورت اور مرد گڈّے گڑیاں بنکر رہجائیں گے فیروز نے بات پوری ہی کی تھی کہ سامنے سے ایک دوسرا گنوار آگیا۔ دونوں گاؤں والوں میں بات چیت ہونے لگی۔ گاؤں والوں کی باتیں بہت پُرلطف ہوتی ہیں، مگر فیروز اس انتظار میں تھا کہ ان دونوں کی راگ مالا ختم ہو اور اس کا رُکا ہوا سفر شروع ہو جائے۔ خدا خدا کرکے دونوں گنواروں کی باتیں ختم ہوئیں اور وہ بھی اِس طرح کہ فیروز نے دو تین مرتبہ انھیں ٹوکا۔

اب فیروز اور گاؤں والا دونوں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہو چل رہے تھے۔ باتیں، کہانیاں اور موسیقی راستہ کاٹنے میں ہمیشہ مددگار اور کارآمد ثابت ہوتی ہیں۔ ہندوستان کے گاؤں والوں کی سادہ اور مزیدار باتیں

عرب کی حُدیٰ خوانی کا کام دیتی ہیں، بات میں بات نکلتی چلی گئی ۔ گاؤں والا کہنے لگا:۔

بابو جی! ایشور کی کرپا سے میرے یہاں کسی بات کی کمی نہیں ہے چین ہی چین اور سُکھ ہی سکھ ہے۔! اب کی دوالی بعد میری چھوری (لڑکی) کا بواہ ہے اس کارج (تقریب) سے نبٹ جانے کے بعد پھر کوئی جنتا ہی مجھے نہ رہے گی۔ میرے سمدھی اپنے گاؤں کے مکھیا ہیں، چار ہلوں کی کھیتی ہوتی ہے اُن کے! بڑے دھوم دھام سے وہ برات لیکر آئیں گے، میں نے بھی کہلا کر بھیجدیا ہے کہ ایک سے لیکر ہزار آدمی تک برات میں لا سکتے ہو۔! مالدار آدمی سے ٹکر آپڑی ہے بابُو جی! جھیلنی ہی پڑے گی ۔! میری دادی نے لڑکی کی جہیز بست کے لئے اپنے پاس سے ڈھائی سیر چاندی اور آدھ پاؤ سونا دیا ہے۔ ایشور نے چاہا تو لڑکی سونے میں پیلی ہوجائے گی ۔! دونوں طرف سے سب باتیں طے ہو چکی ہیں، بس ایک بات کا ذرا سا پیچ آپڑا ہے، لڑکی والے کہتے ہیں کہ ہم برات میں سوانگ والوں کی منڈلی لیکر آئیں گے اور میں نے کہلا کر بھیجا ہے کہ کسی نامی گرامی کنجنی کو لیکر آنا۔ بابو جی! مرد کیسا ہی بڑھیا گانے والا کیوں نہ ہو تیریا (عورت) کی بات کہاں آتی ہے۔

باتوں ہی باتوں میں کنور پور آگیا گاؤں والا فیروز کو کھوانی دھوبی کے یہاں لیکر گیا، کھوانی دھوبی کو آواز دی گئی، دھوبی کی بہو نے گھونگھٹ کی آڑ سے جواب دیا:۔

"گھاٹ پر ہیں ..... وہ تو ...."

کونسے گھاٹ پر   گاؤں والے نے دریافت کیا

دھوبی کی بہو نے جواب دیا، اور دھرم شالہ والے گھاٹ پر

فیروز اور گاؤں والا دونوں دھوبی کے گھر سے روانہ ہوکر گاؤں سے باہر آئے۔
گاؤں والے نے فیروز کو اشارے سے بتایا کہ یہ سامنے جو برگد کے پیڑ دکھائی
دے رہے ہیں ان سے کوئی پچاس قدم کے فاصلہ پر دھرم شالہ ہے۔ دھرم شالہ
کے نیچے تالاب ہے اور وہیں دھوبیوں کا گھاٹ ہے۔ کھوانی دھوبی آپ کو وہیں
ملے گا۔

فیروز برگد کے درختوں سے گزرتا ہوا تالاب کے کنارے پہنچا، بہت سے
دھوبی اپنے مخصوص اور نہ بدلنے والے انداز میں "چھپو..... چھپو" کر رہے تھے
وہ جو شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ ؎

زنند جامہ ناپاک گازراں بر سنگ

تو دھوبی گھاٹ کے ہر پتھر سے سعدی کے اس مصرعے کی صدائے بازگشت
آرہی تھی۔

کھوانی بھی دوسرے دھوبیوں کیساتھ کپڑے دھو رہا تھا، فیروز سیدھا
کھوانی کے پاس پہنچا، کھوانی فیروز کی غیر متوقع آمد سے چونکا۔

میاں! کھیرت (خیرت) تو ہے کھوانی دھوبی نے دریافت کیا۔

ارے بھئی! میری شیروانی کی جیب میں میرا ایک ضروری کاغذ چلا آیا
فیروز نے کہا اور دھوبی نے گیلے کپڑے کو پتھر پہ پھینک کر زمین پر رکھے
ہوئے کپڑے تلاش کرنے شروع کئے۔ اُس نے ایک شیروانی فیروز کو لا
دی، یہ شیروانی فیروز کی شیروانی سے ملتی جُلتی تھی۔ فیروز نے نہایت بے تا

کیسا تھا شیروانی کی چاروں جیبوں کو ٹٹولا، اُوپر کی جیب میں سے موٹر بس کا ایک پُرانا ٹکٹ برآمد ہوا۔

ایں۔! میرا خط کیا ہوا فیروز نے کہتے ہوئے شیروانی کو غور سے دیکھا اور شیروانی کے کالر پر نظر ڈالتے ہوئے بولا:۔

یہ میری شیروانی نہیں ہے۔! یہ تم کس کی شیروانی اُٹھا لائے۔

فیروز کے کہنے پر دھوبی نے میلے کپڑوں کو دیکھا بھالا۔ فیروز کی شیروانی غائب تھی۔

میاں! یہ آپ کی اچکن نہیں ہے؟ دھوبی نے لجاجت آمیز لہجے میں پوچھا۔

کہ تو دیا نہیں ہے، اس شیروانی کا کپڑا میری شیروانی سے البتہ ملتا جُلتا ہے۔ فیروز نے جواب دیا۔

تو پھر میاں! آپ کی اچکن بدل گئی! ہوا یہ کہ میں پرسوں کپتان صاحب کے یہاں سے میلے کپڑے لیکر آیا تھا آپ کے میلے کپڑوں کی گٹھڑی اور کپتان صاحب کے کپڑوں کی گٹھڑی دونوں ایک جگہ رکھی ہوئی تھیں، میرے بچے وہاں کھیل رہے تھے، سب کے بچے نٹ کھٹ ہوتے ہیں، بچوں نے گٹھڑیاں کھولکر کپڑوں کو بکھیر دیا۔ کل شام میں کپتان صاحب کا نوکر میرے گھر پر آکر بولا کہ کپتان صاحب کے گھر کے لوگ اپنے وطن جا رہے ہیں اُن کے کپڑے جس حالت میں بھی ہوں فوراً دیدو! میں نے ان کے کپڑے دیدئے۔ آپ کی اچکن بھی انہی کپڑوں میں چلی گئی اور انکی اچکن یہاں رہ گئی۔ میں تو دھوبی ہوں پہلے پہل خود آپ کو دھوکا ہو گیا آپنے انکی اچکن کو اپنی اچکن سمجھا دھوبی رُکتے ہوئے بولا۔

غضب کر دیا تم نے کھوانی۔ !شیروانی کے جانے کا تو رنج نہیں ہے۔
مگر میرا بہت ہی ضروری خط اُس میں تھا فیروز نے حسرت آمیز انداز میں کہا۔
اب تو میاں! جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔! آپ جانتے ہیں کہ میں نے جان بوجھکر
بھُول نہیں کی اور بھول چوک تو ہر آدمی سے ہو جاتی ہے دھوبی نے جواب دیا۔
کھوانی! تم کپتان صاحب کے یہاں میرے ساتھ چلو اور ان کے یہاں کی
شیروانی اپنے ساتھ رکھ لو فیروز نے دھوبی سے کہا۔
میاں! آپ جانتے ہیں کہ میں اکیلا کام کرنے والا ہوں، کوئی میرا ہاتھ
بٹانے والا نہیں ہے، فوج کا کام ہے ایک دن کی دیری میں دس دس بیس بیس
روپیے جریبانہ (جرمانہ) ہو جاتا ہے۔! اور ہاں! میرے ساتھ چلنے کی کیا ضرورت
ہے۔ آپ ان کے یہاں کی اچکن اپنے ساتھ لیجائیں۔ !کپتان صاحب کا نام مسعود
صاحب ہے، گورا پلٹن سے آگے وکٹوریہ سینما کے سامنے ان کا بنگلہ ہے۔ فوج میں
ایک ایک سپاہی ان کو جانتا ہے، اُنکے بھانجے کی یہ اچکن ہے آپ جا کر کہیں گے تو
وہ اپنی اچکن لیکر آپ کی اچکن ضرور دیدیں گے۔ ان کو تو خود اپنی اچکن کی فکر ہو گی
دھوبی نے جواب دیا اور فیروز شیروانی لیکر وہاں سے روانہ ہو گیا۔!
فیروز سائیکل تھامے ہوئے ہی راستہ سے مکان واپس آیا جس راستہ کے
پیچ وخم نے اُسکی سائیکل کے ٹایر کو ناقابلِ استعمال بنا دیا تھا۔ گھر آکر اُس نے اپنی
سائیکل کو زور سے زمین پر پٹکتے ہوئے کہا:۔
یہ نامعقول سائیکل ہمیشہ وقت پر دھوکا دیتی ہے۔
اور قریب کی دوکان سے کرایہ کی سائیکل لیکر چھاؤنی کی طرف روانہ ہو گیا۔ فیروز

پر بدحواسی طاری تھی۔ کم و بیش دس میل تو اسے ٹوٹی ہوئی سائیکل لیکر پیدل سفر کرنا پڑا۔ رات کا جاگا ہوا، دن کا تھکا ہوا ناکام جستجو۔! اسے بدحواس اور پریشان ہونا ہی چاہیئے تھا۔ راستے میں کئی آدمیوں سے ٹکر ہوتے ہوتے رہ گئی۔! بڑے بازار کے چوراہے پر اُس نے تیزی کے ساتھ سائیکل موڑی، اُدھر سے ایک موٹا تازہ کتا اپنی دُھن میں آرہا تھا، شہری کتے موٹروں اور سائیکلوں کی یوں بھی پرواہ نہیں کرتے وہ سمجھتے ہیں اور سمجھتے کیا ہیں بلکہ اُن کو اس بات کا یقین ہوتا ہی کہ موٹر بگھی اور سائیکل والے خود ہی ان سے بچکر نکل جائیں گے، اس لئے وہ کسی خطرے کی پرواہ نہیں کرتے۔ فیروزہ بدحواس اور بوکھلایا ہوا سا تھا۔ کتے سے سائیکل کی ٹکر ہوئی اور فیروزہ دھڑام سے سڑک پر گر گیا۔ کتا سائیکل کی چوٹ کھا کر جو دُم دبا کر بھاگا ہی تو بھاگتا ہی چلا گیا۔ خوفزدہ اور بھاگتے ہوئے کتے کا دوسرے کتوں نے پیچھا کیا اسی طرح فیروزہ کا سائیکل سے گرنا بازار کے کتوں کیلئے "دیوانہ راہوئے بس ہست" بنکر رہ گیا۔ فیروزہ کے چوٹ زیادہ نہیں آئی، سڑک کی کنکریاں اس کی پیشانی میں چبھ گئیں جس کی وجہ سے خون کے کچھ قطرے نکلکر رہ گئے۔ لہو کی سُرخی اسکے ماتھے سے اچھی طرح نمایاں تھی۔ فیروزہ نے اُٹھ کر سائیکل اُٹھائی اور نہایت عجلت کیساتھ سوار ہو کر چل ہی تو دیا۔

چھاؤنی میں کپتان صاحب کو سب جانتے تھے انکا بنگلہ تلاش کرنے میں ذرا سی دیر بھی نہیں لگی۔ دھوبی نے اتنا ٹھیک اور مفصل پتہ بتا دیا تھا کہ فیروزہ نے کپتان صاحب کے بنگلہ پر پہنچکر دم لیا، بنگلہ کے دروازے پر ان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی، فیروزہ سائیکل لیئے ہوئے اندر پہنچا، پہرے کے سنتری نے فیروزہ کو

نہیں ٹوکا وہ سمجھا کہ یہ کپتان صاحب کا کوئی عزیز ہی۔ اس قدر بے تکلفی کیساتھ عزیز رشتہ دار ہی کسی کے مکان میں جا سکتا ہی۔ بنگلہ کے برآمدے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اخبار پڑھ رہا تھا۔ فیروز نہایت بیباکی کے ساتھ دراتا ہوا برآمدے میں پہنچا فیروز کے پیروں کی چاپ سُنکر وہ آدمی چونکا اس نے دیکھا کہ ایک بدحواس اور آشفتہ حال نوجوان جس کی پیشانی پر لہو لگا ہوا ہی اس کی طرف آرہا ہے۔ اُس نے اخبار میز پر رکھ دیا اور کرسی پر ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ فیروز نے اس انداز میں سلام کیا جیسے وہ اس آدمی کو "چیلنج" دے کر کہہ رہا ہو کہ میں آگیا۔ تشریف لے آیا، وارد ہو گیا۔

یہ آپ کے یہاں کی اچکن ہی، میری شیروانی مجھے عنایت فرمائیے

فیروز نے بنگلہ کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے آدمی سے کہا۔

آپ کون ہیں ؟ کیسی شیروانی، کس کی اچکن ؟ کیا کہہ رہے ہیں آپ

اُس شخص نے جواب دیا۔

میں نے کھوانی دھوبی کے یہاں اپنی شیروانی دُھلنے کے لئے ڈالی تھی دھوبی کی زبانی معلوم ہوا کہ کپتان مسعود صاحب کے بھانجے کی شیروانی سے شیروانی بدل گئی میں اپنی شیروانی لینے کے لئے آیا ہوں فیروز پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔

کپتان صاحب کے بھانجے تو آج صبح کی ٹرین سے الہ آباد چلے گئے

آدمی نے جواب میں کہا۔

اس جواب کو سُن کر فیروز سکتے کی تصویر بنکر رہ گیا، کل سے مسلسل اسی قسم کی ناکامیاں

ہو رہی تھیں

کپتان صاحب کے بھانجے کا پتہ مل سکتا ہے فیروز نے انتہائی عجز کیساتھ کہا۔ اس کے جواب میں وہ آدمی مکان کے اندر گیا اور ایک چھپا ہوا کارڈ فیروز کو دیتے ہوئے بولا:۔

یہ ہے ان کا ایڈریس ؟

فیروز نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کارڈ جیب میں رکھ لیا اور پوچھنے لگا:۔

الہ آباد کے لئے گاڑیاں کن اوقات میں جاتی ہیں۔

اس شخص نے جواب میں کہا:۔

یہ آپ کو ریلوے اسٹیشن پر معلوم ہو سکے گا۔

فیروز نے اس پر پشیمان ہو کر "شکریہ" کہا اور اس آدمی نے بڑی مشکل سے ہنسی ضبط کی۔

یہ آپکی پیشانی پر لہو لگا ہوا ہے اس آدمی نے دریافت کیا۔

جی ہاں! میرے ماتھے پر چوٹ لگ گئی اور اس کا سبب ہے کسی مغرب زدہ کے آوارہ کتے کی بے احتیاطی بلکہ بدتمیزی! صاحب! وہ آنکھوں کا اندھا کتا میری سائیکل سے ٹکرا گیا، میرے تو خیر لہو کی دو چار بوندیں نکلکر رہ گئیں مگر اس کتے کے تو وہ چوٹ آئی ہے کہ ساری عمر یاد رکھے گا کہ ہوئی تھی کسی نوجوان کی سائیکل سے ٹکر۔! اور پھر .... فیروز کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ماما نے اندر سے آواز دی اور وہ شخص اندر چلا گیا۔ فیروز اس کے باہر آنے کا انتظار کئے بغیر اپنے گھر چلا آیا۔!

فیروز کے دل میں سینکڑوں وہم پیدا ہوتے تھے اسکی طبیعت وہمی اور شکی نہ تھی لیکن ایسی صورت میں شکوک اور اوہام اور ظن و تخمین کا پیدا ہونا ضروری بلکہ

فطری امر تھا۔ کبھی سوچتا کہ وہ خط کسی کی بے احتیاطی اور غفلت کے سبب کھو نہ گیا ہو، کبھی خیال آتا ہے کہ ممکن ہو خط کسی شریر النفس اور سازشی کے ہاتھ پڑ جائے اور وہ اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے۔ غرض اوہام اور شکوک کا لا متناہی سلسلہ اس کے دل و دماغ میں پیدا ہو رہا تھا، وہم بڑھتے ہی جاتے تھے اور نفسی کشمکش اور ذہنی خلفشار میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ خود اپنے کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ میں نے اتنے ضروری خط کو شیروانی کی جیب میں کیوں رکھ دیا۔ وہ خط تو سات تالوں کے اندر بند کر کے رکھنا چاہیے تھا اور سب سے پہلے خط پڑھتے ہی خط لکھنے والے کا پتہ نوٹ بک میں درج کرنا ضروری تھا۔ جھنجلاہٹ اور غصہ کی حالت میں آدمی کے ہوش و خرد متوازن نہیں رہتے، فیروز کو اپنے سے زیادہ قدرت پر غصہ تھا کہ مشیت خداوندی اور قدرت اسکے زخموں سے کھیل رہی ہو اور یہ سب کچھ الجھنیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ آدمی تو بالکل مجبور بلکہ قدرت کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔! قدرت نے پہلے تو یہ کیا کہ صندوق یا دراز میں خط رکھوانے کی بجائے شیروانی میں خط رکھنے کی مجھے ترغیب دی، پھر وہ شیروانی میرے ہاتھ سے دھوبی کے یہاں بھجوادی اور اس پر ستم بالائے ستم یہ کہ میری شیروانی کپتان صاحب کی بھانجے کی شیروانی سے بدلوادی، قدرت لے اسی ستم ظریفی پر بس نہیں کی، زخموں پر نمک چھڑکا بلکہ ان میں اور نشتر چبھودئے اور وہ یہ کہ کپتان کے بھانجے صاحب میری شیروانی اور خط لیکر الہ آباد تشریف لے گئے۔ ان کڑیوں کے ملانے سے اس کے سوا اور کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا کہ قدرت کا قانونِ جبر انسانوں کی بے بسی اور کم زوری سے مذاق کرتا ہے۔ جان بوجھ کر مشکلات پیدا کیجاتی

ہیں اور سوچ سمجھ کر دشواریوں اور پریشانیوں کی "لے" کو بڑھا دیا جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ بادشاہ، رئیس اور دولت مند جنگی ہوسناکیوں اور دست درازیوں کی کوئی حد ہی نہیں ہے ضرور اس قابل ہیں کہ مشیت اپنے جبر کی تمام قوتیں اُن کی تنبیہ اور سرکوبی کے لئے استعمال کرے، مگر مجھ غریب نے قدرت کا آخر کیا بگاڑا ہے کہ مجھسے انتقام لیا جا رہا ہے۔؟ میری راہ میں تو قدرت کو اور آسانیاں اور سہولتیں پیدا کرنی چاہیئے تھیں، مشیت کے عدل کی دہائی! قدرت کے انصاف سے فریاد

متضاد اور بہکے ہوئے خیالات کی اس کشمکش میں فیروز اُلجھا ہوا تھا، فیروز ہی پر کیا منحصر ہے ہر ناکام اور پریشان انسان پر زندگی کے کسی نہ کسی لمحہ میں اس قسم کے خیالات کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری اور ناشکر گزاری ہے، مگر اس کمزوری کی تخلیق بھی تو قدرت ہی کے حرفِ "کُن" کی رہین منت ہے! زندگی کا یہی وہ دوراہا ہے جہاں بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں اور وہ انسان جو ایک گھونٹ پانی اور ہوا کے سرد جھونکے کا بھی صحیح معنوں میں شکر ادا نہیں کر سکتا اس عالم میں پہنچکر اور ابتلا و آزمائش سے گھبرا کر "عبد کفور" اور "بندۂ ناشکر گزار" بن جاتا ہے۔

ترے غم کی شکایت کر رہا ہوں
یہ کیا کفرانِ نعمت کر رہا ہوں

کفرانِ نعمت کے اس جُرم سے دنیا میں بہت ہی کم انسان محفوظ رہ سکتے ہیں۔

فیروز کو بہرصورت خط کی تلاش میں الہ آباد جانا ضروری تھا۔ لیکن اپنے حالات کے اعتبار سے وہ الہ آباد ایکا ایکی نہیں جا سکتا تھا۔ دو تین دن ضروری انتظامات

میں صرف ہو گئے، اور وہ بالآخر الہ آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ وہ جو کسی تجربہ کار کی آزمائی ہوئی ضرب المثل اور کہاوت ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کر پیتا ہے" تو فیروز بھی الہ آباد جاتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ وہاں جاکر کسی دوسری اور نئی الجھن کا ظہور نہ ہو جائے۔ پچھلے واقعات نے فیروز کے زاویہ نگاہ کو قدرے تاریک بین بنا دیا تھا یعنی وہ تصویر کے روشن پہلو سے زیادہ اسکے تاریک اور مبہم پہلو کو غور سے دیکھتا تھا اور امیدوں کے ہجوم میں ناامیدی پر اس کی نظر زیادہ جمتی تھی۔

جاڑے کا زمانہ تھا مسافر کمبلوں اُونی چادروں اور رضائیوں میں لپٹے ہوئے ٹرین میں بیٹھے تھے۔ سگرٹ کے دھوئیں نے ریل کے ڈبوں کو دوزخ کا وہ مقام بنا دیا تھا جہاں دھوئیں کے ذریعہ گنہگاروں کو عذاب دیا جائیگا۔ ایک تو مسافروں کی کثرت تھی پھر جاڑے میں مسافروں کے لحافوں اور توشکوں سے کافی جگہ گھر جاتی ہے، فیروز نے انٹر کلاس کے ایک ڈبے کے دروازے کو کھولنا چاہا، دروازے کے قریب بیٹھے ہوئے آدمی نے کرخت لہجہ میں کہا:۔

یہاں جگہ نہیں ہے کسی اور ڈبہ میں جگہ ڈھونڈیئے۔

فیروز دوسرے ڈبہ پر پہونچا، وہاں دو تین مسافروں نے بہ یک وقت گلا پھاڑ کر ارشاد فرمایا:۔

"یہاں آدمی پر آدمی بیٹھا ہوا ہے، یہاں آنے کی کوشش ہی نہ کیجیے"۔

اب انٹر کلاس کا بس ایک ڈبہ اور باقی رہ گیا تھا، فیروز وہاں گھبرایا ہوا پہنچا اور دروازے کے شیشہ سے جھانک کر اندر دیکھا ہی تھا کہ آواز آئی:۔

"جگہ نہیں ہے"

فیروز نے مایوس مگر التجا آمیز نگاہوں سے قلی کی طرف دیکھا، قلی بولا :-

یہ ریل گاڑی ہے یہاں بھلمنساہت سے کام نہیں چلتا جب تک آپ خود قوت کیساتھ ڈبہ میں گھسنے کی کوشش نہ کریں گے جگہ نہیں مل سکتی۔

فیروز قلی کے اس کہنے پر ایک ڈبہ پر پہنچا دروازہ بند تھا فیروز نے دروازہ کھولنا چاہا تو اندر سے ایک مسافر پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا، ڈبہ کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ قلی کے اشارہ کرنے پر فیروز قلی کے بدن کا سہارا لیکر کھڑکی میں داخل ہو گیا، اندر کے مسافر چلاتے ہی رہے مگر فیروز اندر پہونچ چکا تھا۔ قلی نے جلدی جلدی اُس کا سامان کھڑکی کی راہ سے اندر پہنچایا، اب مسافروں نے جھنجلاہٹ اتارنے کے لئے غریب فیروز پر فقرے کسنے شروع کئے :-

لوگ دوسروں کے سروں کو کچلتے ہوئے ڈبوں میں داخل ہوتے ہیں۔

ایسا ہی سفر کرنے کا شوق ہے تو فرسٹ کلاس کا ٹکٹ لیا ہوتا۔

آج کل آدمی کا تنہا سفر کرنا مشکل ہے اور لوگ دو دو ٹرنک لیکر گھر سے نکل پڑتے ہیں۔

اگر کھڑکی میں داخل ہوتے وقت اندر سے کوئی دھکا مار دیتا تو میاں پلیٹ فارم پر لڑھکتے ہوئے نظر آتے۔

غرض ہر مسافر فیروز کو عتاب آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے اس غریب نے انکی جائداد چھین لی ہے، آدمی فطرتاً خود غرض واقع ہوا ہے اور اس خود غرضی کے مناظر ٹرینوں میں نظر آتے ہیں۔ ٹرین میں سوار ہونے کے بعد آدمی مروّت، اخلاق، ہمدردی اور ایثار کو تہ کرکے رکھ دیتا ہے، اچھے خاصے متمدّن انسان میں درندگی اور بیگانگی پیدا ہو جاتی

ہے۔ آنکھوں میں مروت اور دل میں ہمدردی باقی نہیں رہتی، آدمی کو آدمی کا دشمن دیکھنا ہو تو ریل کا سفر کرو، پلیٹ فارم پر پہنچتے ہی اخلاق و ہمدردی کے سرچشمے خشک ہوجاتے ہیں، میدان قیامت میں بھی شاید اس قدر "نفسی، نفسی" نہ ہوگی۔

فیروز بہت ہی تھوڑی جگہ پر بدن سمیٹ کر بیٹھ گیا۔ سردی میں بدن کا سکڑنا اور اعصاب کا سمٹنا ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ فیروز کے قریب ہی ایک صاحب پاؤں پھیلائے ہوئے اس آزادی اور اطمینانِ خاطر کیساتھ سو رہے تھے جیسے انھوں نے ریلوے کمپنی سے اس سیٹ کا باضابطہ پٹہ کرالیا ہو اور انکے مالکانہ حق سے کوئی بیدخل نہیں کرسکتا۔ فیروز نے ایک آدھ دفعہ کہا کہ ذراسی ہمیں بھی جگہ دیدیجئے تو وہ مسافر غصہ کے ساتھ "اونہہ" کرکے رہ گیا۔ فیروز نے بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا وہ اسی میں خوش تھا کہ ڈبہ میں اسے جگہ تو مل گئی۔ راستہ کے اسٹیشنوں پر مسافر اترتے چڑھتے رہے اور قریب قریب ہر اسٹیشن پر جھگڑا ہوتا رہا، ہندوستانی اس طرح ٹرینوں میں شاید "جنگِ آزادی" کی مشق فرماتے ہیں۔ فیروز نے آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دی پوری رات میں مشکل سے دوچار نیند کی جھپکیاں آئی ہوں گی۔ صبح ہوئی، کہر چھنٹا، سورج کی کرنیں نمودار ہوئیں، فیروز کی سامنے کی سیٹ پر ایک بوڑھا آدمی سگرٹ پی رہا تھا اُس نے جیب سے نوٹ بک نکالکر کچھ لکھا اور پھر ایک خط کوٹ کی دوسری جیب سے نکالکر پڑھنے لگا، خط پڑھنے کے بعد اُسنے پھر جیب میں رکھ لیا۔

خط کوٹ یا شیروانی کی جیب میں نہیں رکھنا چاہیے، یہ احتیاط کے خلاف ہے — فیروز نے بوڑھے مسافر سے کہا۔

اس میں ہرج کیا ہے — بوڑھے مسافر نے جواب دیا۔

بہت بڑا ہرج ہے یعنی یہ کہ آپ دھوبی کو شیروانی یا کوٹ دھلنے کے لئے دیدیں اور آپ کا خط کوٹ کی جیب میں غلطی سے رہ جائے ——— فیروز بولا۔

ہم میلے کپڑے دھوبی کو دینے سے پہلے کوٹ کی جیبیں غور سے دیکھ لیا کرتے ہیں اور ہمارا دھوبی بہت اطمینان کا آدمی ہے۔ ایک دفعہ میرے نوٹوں کا بٹوہ اسکے یہاں چلا گیا تھا اور اس نے واپس کر دیا ——— مسافر نے کہا۔

یہ سب کچھ درست ہے مگر اس کا کیا علاج ہے کہ بعض وقت دھوبی کے یہاں کپڑے بدل جاتے ہیں یعنی میری شیروانی آپ کی شیروانی سے بدل گئی، آپ کا کوٹ کسی کپتان صاحب کے یہاں پہنچ گیا اور کپتان صاحب کی چادر کسی سیٹھ جی کے گھر چلی گئی ——— فیروز نے جواب دیا۔

تو اس قسم کے حادثات کو تو کوئی انسان روک نہیں سکتا ...... اور دُنیا ...... مسافر کہہ ہی رہا تھا کہ الہ آباد اسٹیشن آگیا اور فیروز جلدی سے اُتر گیا، قُلی نے سامان اٹھایا اور فیروز گیٹ پر ٹکٹ دیکر اسٹیشن سے باہر آیا۔ ہوٹلوں کے ایجنٹ مسافروں کی تلاش میں بہت پہلے سے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک ہوٹل ایجنٹ سے گفتگو ہوئی اور فیروز بگھی میں سامان رکھ کر ہوٹل چلا گیا۔

فیروز ہوٹل میں آکر نہایا دھویا کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لئے پلنگ پر لیٹ گیا۔ اُس نے کپتان صاحب کے بھانجے کی تلاش میں شام کے وقت جانا مناسب سمجھا اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے کپتان صاحب کا بھانجا کسی دفتر میں ملازم ہو یا کوئی اور کاروبار کرتا ہو۔ سردی کے زمانہ میں شام کے وقت عام طور پر لوگ اپنے گھروں پر رہتے ہیں۔

شام کے وقت اس نے تانگہ کرایہ پر لیا اور کپتان کے بنگلہ میں بیٹھے ہوئے آدمی نے اُسے جو پتہ کا کارڈ دیا تھا اسی کی تلاش میں وہ روانہ ہو گیا۔ تانگے والے بڑے مردم شناس اور چالاک ہوتے ہیں۔ نو وارد مُسافر کی عدم واقفیت اور اجنبیت سے وہ پُورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فیروز کی بدحواسی اور گھبراہٹ کو دیکھ کر تانگے والے نے ایک نظر میں تاڑ لیا کہ ان حضرت کی سادگی فائدہ مند ثابت ہو سکتی ہے۔ تانگہ والا شہر کی گلیوں میں غریب فیروز کو گھماتا رہا، اس تصور کیساتھ کہ جتنی زیادہ مسافت طے ہو گی اُتنا ہی زیادہ کرایہ ملے گا۔!

شام ہو چکی تھی، بجلی کے قمقمے سردی کی کہر آمیز فضا کو روشن کر رہے تھے، تانگہ والے نے ایک چوراہہ پر پہنچ کر تانگہ روکا ..... یہ کہتے ہوئے:۔

مَیں گھوڑے کے لئے گھانس لیلوں۔

گھانس کا نرخ چُکانے اور تانگہ میں گھانس بھرنے میں کافی دیر ہو گئی، مغرب کے بہت دیر بعد تانگہ اس محلہ میں پہنچا جہاں کے لئے فیروز روانہ ہوا، ایک تنگ گلی کے نکڑ پر دوکان والے نے اُنگلی کے اشارے سے بتایا کہ ڈپٹی صاحب (کپتان صاحب کے بہنوئی) کا سامنے والا مکان ہے اور تانگہ کو بائیں جانب کی سڑک سے وہاں جانا پڑے گا۔ فیروز اسی جگہ اُتر گیا اور تانگہ والے کو کرایہ دیکر تنگ گلی سے گذر کر مکان پر پہنچا۔!

اس مکان کی مردانہ بیٹھک کی کھڑکیاں گلی کی جانب تھیں۔ گلی نشیب میں تھی اور مکان اونچائی پر۔! بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی اور وہاں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں خوب تیز تیز گفتگو ہو رہی تھی، اس جملہ کو سُنکر:۔

یہ خط دھوبی کے یہاں سے لائے ہوئے کپڑوں سے برآمد ہوا ہے۔

فیروز بیٹھک کی کھڑکی کے سہارے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک شخص نے خط پڑھکر سنایا خط کا مضمون :-

فیروز صاحب!

"آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ فیروز پور میں آپکی فصیح و بلیغ اور دلچسپ تقریریں سُن چکی ہوں۔ آپ کے مضامین بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔! ایک پردہ نشین اور شریف لڑکی کا ایک غیر مرد کو اس طرح خط لکھنا یقیناً قابلِ اعتراض ہے۔ مگر یقین جانئے کہ اس اقدام میں کوئی بُرا تصور کارفرما نہیں ہے۔ یہ خط ایک معصوم دل کا سادہ پیام ہے! میں اس اقدامِ معصوم پر بھی پشیماں ہوں مگر ایک شدید جذبہ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔!

کیا آپ میری اور اپنی زندگی کے متعلق غور فرمانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے؟ مذہب نے عورت کو مرد کی اور مرد کو عورت کی تسکین و اطمینان کا سبب بنایا ہے میری نیازمندی اور وفاداری آپ کے سکونِ قلب کا باعث بن سکے گی! یہ چند لفظ میں نے طبیعت پر جبر کر کے لکھے ہیں یقین ہے کہ آپ میرے اس اقدام پر مجھے معذور تصور کرتے ہوئے معاف فرما دیں گے۔!

میں نے آپ کا پتہ ایک رسالہ کے ایڈیٹر سے حاصل کیا ہے، اپنا پتہ میں نیچے لکھ رہی ہوں۔ اگر ضرورت سمجھیں تو جواب عنایت فرمادیں

اس سے زیادہ مجالِ عرض نہیں کہ نسوانی غیرت اس جرأت پر عرق آلود ہے۔

اس خط کو سنکر بیٹھک میں بیٹھے ہوئے لوگ تیز تیز گفتگو کرنے لگے :-

اچھا ہوا کہ نظیر میاں کو یہ خط مل گیا، نہیں تو ہماری بے خبری کے عالم میں نہ جانے کیا گل کھل جاتا۔

یہ لڑکی پردے ہی پردے میں خاندان کی ناک کٹوا دینا چاہتی ہے۔

آج کل کی لکھی پڑھی لڑکیاں آسمان میں تھگلی لگانا چاہتی ہیں۔

ابا جی! اس ناصرہ کی شادی میں بہت ہی جلدی کرنے کی ضرورت ہے۔

میں تو چاہتا ہوں کہ کل کے ہوتے آج بیاہ ہو جائے۔

تو بسم اللہ! اظہر میاں کیساتھ نسبت کر دیجائے بلکہ عقد ہی ہو جائے۔

بھئی! پڑھی لکھی جوان لڑکی ہے اُسے بلا کر سمجھانا چاہیئے اور اسکی مرضی اور اطلاع کے بغیر نکاح کا قصد کرنا مصلحت اور دانشمندی کے خلاف ہے۔

اگر اس نے کچھ چون و چرا کی تو پھر اسکو مجبور کیا جائیگا ماں باپ کا اپنی بیٹی پر بہت کچھ حق بلکہ زور ہے۔

فیروز دیوار کے سہارے کھڑا ہوا یہ تمام باتیں سُن رہا تھا، جاڑے کا زمانہ تھا سرد ہوا چل رہی تھی مگر فیروز کو پسینہ آ رہا تھا، اسکی سانسیں گرم نہیں تیز بھی ہو گئی تھیں فیروز نے سُنا کہ ایک بوڑھے آدمی نے درشت لہجہ میں کہا :-

ناصرہ اور اسکی ماں کو یہاں بُلا لیا جائے۔

تھوڑی دیر تک بیٹھک میں سکوت طاری رہا اور پھر ناصرہ اور اس کی ماں وہاں

آگئیں۔ فیروز نے پنجوں کے بل کھڑا ہو کر کھڑکی کی آڑ سے دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی سمٹی ہوئی کرسی پر بیٹھی ہے۔ سرخ و سپید رنگ، گھنی پلکیں، جٹی بھویں، جھکی ہوئی نظریں لبوں پر سنجیدگی مسکراتی ہوئی۔! لباس کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ قیامت باقرینہ اور صاحب سلیقہ بھی ہے۔

بوڑھے آدمی کے اشارہ کرنے پر چند آدمی بیٹھک سے اٹھکر اندر چلے گئے۔

بیٹی ناصرہ! تمسے ایک ضروری مشورہ کرنا ہے ——— بوڑھے آدمی نے دریافت کیا۔

جی! میں حاضر ہوں ——— ناصرہ نے شرما کر جواب دیا۔

تم اپنے دادا میاں کو اپنا ہمدرد سمجھتی ہو؟ ——— آدمی نے پوچھا۔

اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے ——— ناصرہ بولی

تمھارے دادا ابا اظہر میاں کے ساتھ تمھاری نسبت کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں تمھاری مرضی معلوم کرنے کی بھی ضرورت ہے ——— بوڑھے آدمی کے اس کہنے پر ناصرہ نے شرما کر گردن جھکا لی اور اسکے جواب کا انتظار کئے بغیر دو تین آدمی بیچ میں بول پڑے:۔

ناصرہ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے، ناصرہ اپنے دادا میاں کی مرضی کے خلاف تنکا بھی نہیں توڑتی، شریف لڑکیاں اپنے خیر خواہ سرپرستوں کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہتی ہیں۔

ماشاءاللہ! مبارک ہو! کتنا مناسب رشتہ ہے! اظہر ہمارے خاندان کا سب سے قابل لڑکا ہے! کپتان صاحب کا اکلوتا بیٹا! لاکھوں روپیہ کی جائداد کا تنہا وارث۔!

میں تو کہتا ہوں کہ ناصرہ کی زندگی پر نواب زادیاں فخر کریں گی۔

ناصرہ کے لبوں پر غیرت وحیا اور عتاب وحیرت کے متضاد جذبات نے مہر خاموشی لگادی تھی۔ اس کا چہرہ غصّہ سے تمتما رہا تھا اور سب دیکھنے والے یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ حیا کی سُرخی ہے۔

میری بات کا جواب دو، ناصرہ! ——— بوڑھے آدمی نے کہا، اس پر دوسرا آدمی کھانستے ہوئے بولا:۔

بڑے صاحب! کنواری لڑکیاں بیاہ شادی کے مُعاملہ میں بولا نہیں کرتیں اُن کی خاموشی ہی اُن کا "اقرار" ہوتی ہے۔! آپ دیکھ نہیں رہے ہیں کہ بیچاری ناصرہ کا چہرہ شرم وحیا کے مارے سُرخ ہوا جارہا ہے! غریب و معصوم ناصرہ اپنے گھر والوں کے کہے سے باہر نہیں ہو سکتی، اس کی طرف سے میں کہتا ہوں کہ اپنے دادا میاں کا ٹھیرایا ہوا رشتہ اسے منظور ہے۔!

اِس پر سب لوگ "مبارک.... سلامت" کہنے لگے، ناصرہ عجیب کشمکش میں تھی اور اب اس کا چُپ رہنا اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گیا تھا اُس نے ہمت کر کے کچھ کہنا چاہا مگر دو چار بے ربط لفظ ہونٹوں پر آ کر رہ گئے جذبات کی شدت نے پھر اسے اُبھارا اور اسنے اب کی مرتبہ کہہ ہی دیا:۔

میں اس بات کا جواب سوچ کر دوں گی۔

بس ناصرہ کے اس کہنے پر تمام لوگ آتش زیر پا ہو گئے جیسے کسی نے اسکے بدن پر پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔

ادھوری! لڑکی! تیری یہ جرأت اور دیدہ دلیری ——— ایک آدمی نے کہا۔

دیکھنے میں تو بڑی بھولی بھالی لگتی ہی مگر یہ جتنی اوپر ہے اُتنی ہی نیچے ہے۔
دوسرا آدمی بولا۔
ہمارے خاندان میں تو آجتک کسی لڑکی نے شادی بیاہ کے معاملہ میں اپنی زبان سے ایک لفظ نہیں کہا ——— تیسرے آدمی نے کہا۔
ہمیں سب کچھ معلوم ہو گیا ہی۔ تو ہمیں دھوکا دینا چاہتی ہی۔! یہ مردود فیروز کون ہی جسے خط لکھے جاتے ہیں ——— چوتھا آدمی بولا۔
فیروز کا نام سنکر ناصرہ چونک پڑی اور ایک ایک کا منہ حیرت کیساتھ تکنے لگی، ایک لمحہ میں ذہن نے تصورات وخیالات کے بہت سے پردے اٹھا کر چھوڑ دئے۔!
آجکل کے لڑکوں کو آوارگی کے سوا اور آتا ہی کیا ہی۔ شریف عورتوں کو متاثر کرنے کے لئے گا گا کر شعر پڑھتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں، رسالوں میں مضامین اور افسانے چھپواتے ہیں، یہ فیروز بھی کوئی اسی قسم کا آوارہ منش لونڈا معلوم ہوتا ہی۔ اور.... ہاں ...... ـــــ کہنے ولے کی بات کاٹ کر ناصرہ بولی:۔
آپ مجھے جو چاہے کہہ لیجئے، انھیں کچھ نہ کہئے۔
اس پر بوڑھے آدمی نے انتہائی غضبناک تیوروں کے ساتھ کہا:۔
فیروز کیا چیز ہی ہم اسکے باپ اور سات پشت کو گالیاں سنائیں گے۔!
ناصرہ! میں جتلائے دیتا ہوں کہ تیرا ارادہ پورا نہیں ہو سکتا۔
فیروز بہت دیر سے انگاروں پر کھڑا سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا، بوڑھے کے آخری جملے پر اس سے ضبط نہ ہو سکا وہ تیزی کیساتھ اندر پہنچا اور درشت وغضبناک انداز میں بولا:۔

دو محبت کرنے والے دلوں کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی، ناصرہ کا ارادہ پورا ہو کر رہے گا۔

مجلس میں سناٹا چھا گیا، ناصرہ کے رخسار کے گڑھے پر مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ عشق، محبت کو آئینہ دکھا رہا تھا، آرزوئیں تمناؤں کے مقابل تھیں۔ معصوم حسن پاکباز محبت کی جرأت پر قدر و تحسین کے پھول نچھاور کر رہا تھا ناصرہ کے دوپٹہ پر فیروز کی نگاہوں نے ایک اور پردہ ڈال کر زبان حال سے کہا

ع کہ وقف ہے یہ تجلّی مری نظر کے لئے

ناصرہ کی خاموش نگاہوں نے جواب دیا:-

دِل ازل ہی سے ترے حُسن کا شیدائی ہے
وہ جو اک چوٹ پُرانی تھی اُبھر آئی ہے

ختم شد

کتبہ اشفاق احمد ۸۹۸ حویلی اعظم خاں۔ دھلی

Books